ارسطو
حیات و تعلیمات، فکر و فلسفہ
شاہد مختار
شکیل

- غصہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور ندامت پر ختم ہوتا ہے۔
- سب سے بڑا بزدل وہ ہے جو موت سے ڈرتا ہے۔
- ناامید ہونے سے عمر گھٹتی ہے۔
- مخلوق خدا کے لیے دنیا میں کوئی چیز اس سے بہتر و مبارک نہیں کہ بادشاہ نیک ہو اور بڑے حاکم سے بڑھ کر خلق کے لیے کوئی مصیبت نہیں۔
- خاموشی سب سے زیادہ آسان اور سب سے نافع عبادت ہے۔
- سخی خواہ مفلس ہو، لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ بخیل خواہ دولتمند ہو وہ لوگوں کے دلوں میں عزت حاصل نہیں کر سکتا۔
- عقل ہی وہ جوہر ہے جو انسان کو فضیلت ماب بناتا ہے سلسلہ نسب کسی واسطے باعث فخر نہیں ہو سکتا نسبی فضیلت پر فخر کرنے والا احمق ہے۔

ارسطو

# ارسطو

## حیات و تعلیمات، فکر و فلسفہ

شاہد مختار

شاہد پبلشرز اینڈ بک سیلرز
چوبرجی سنٹر ملتان روڈ لاہور۔ فون: ۷۴۱۹۹۶۳

زندہ کتاب کی علامت

مصنف ـــــ*ـــــ شاہد مختار
ناشر ـــــ*ـــــ شاہد پبلشرز
مطبع ـــــ*ـــــ شریف پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ـــــ*ـــــ عمران بٹ
ٹائٹل ـــــ*ـــــ احسان احمد صدیقی
قیمت ـــــ*ـــــ [illegible] روپے
150

# فہرست

# انتساب

ہم ہمیشہ کے سیر چشم سہی
تجھ کو دیکھیں تو آنکھ بھرتی نہیں
یہ محبت ہے، سن! زمانے سن!
اتنی آسانیوں سے مرتی نہیں

(احمد فراز)

"دو جسم ایک جان"
افتخار مجاز اور اعزاز احمد آذر
کے نام

(شاہد مختار)

# دیباچہ

**سقراط نے بنی نوع انسان کو فلسفہ دیا اور ارسطو نے یہ فلسفہ سائنس کو دے دیا۔**

**(اتیان)**

ارسطاطالیس جسے دنیا ارسطو کے نام سے جانتی ہے صحیح معنوں میں ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے سقراط اور افلاطون کے علمی تصورات کو نہ صرف استقراء بلکہ منطقی استدلال دونوں لحاظ سے معراج کمال تک پہنچایا اور پھر اپنے فلسفہ حقیقت میں ایسے اصول وضع کیے جن کی اہمیت و افادیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ اس نے علم سیاسیات کو ایک خودمختار اور الگ علم کی حیثیت دی جس کے باعث اسے سیاسیات کا بانی اور ہر دور کا امام مانا گیا ہے۔ اس نے ذاتی مشاہدات اور تجربات کی بنا پر نئے نئے تصورات پیش کئے جنہیں آج بھی معاشرتی اور سائنسی علوم کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس نے سائنس، فلسفہ و منطق کی ایسی اصطلاحات ایجاد کیں جن سے موجودہ دور کے فلسفی اور سائنس دان استفادہ کر رہے ہیں۔ اس نے نہ صرف ایک مستقل سائنس کی تخلیق کی بلکہ اس کی مختلف جزئیات اور تفصیلات سے بھی دنیا کو روشناس کروایا۔ اس نے تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے

دنیا کو بتایا کہ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعے افراد اور مملکت کے حقوق و فرائض اور اختیارات کے دائرہ کار کا تعین ممکن ہے۔

ارسطو نے اپنی تصنیفات میں تفکر کی مختلف صورتوں سے علم کا مفصل نظام مرتب کیا اور اس کا دبستان فلسفہ آج بھی موثر ترین نظام مانا جاتا ہے۔ اس نے ایک نئے علم منطق کو مدون کیا اور اپنے خیالات کی گہرائی تک رسائی کے لیے اس علم سے مدد حاصل کی۔ جس کے باعث دور جدید میں ہونے والی تحقیق اس کے اسلوب تحریر کے نئے گوشوں کو بے نقاب کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ارسطو کے نزدیک تفکر کا دارومدار استدلال یا سائنسی ثبوت پر ہے اسی بنیادی وجہ سے اس نے اپنی تمام تر تحقیقات و تخلیقات میں جذبات و خواہشات پر عقل کی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بجا طور پر کامیاب نظر آتا ہے۔ آیئے دنیا کے اس عظیم فلسفی کی حیات و تعلیمات و فکر و فلسفہ سے مستفید ہوں جس نے اپنے خیالات و تصورات کو علمی دنیا میں مجسم کرکے اس کو حقیقی صناعی بخشی!

شاہد مختار

# ارسطو کے مختصر حالات زندگی

قدیم یونانی فلسفی، سائنس دان اور ہر عہد کا عظیم مفکر ارسطو جس کا اصل نام ارسطاطالیس تھا یونان کے ایک چھوٹے سے قصبے سٹاگرہ (Stagira) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے 384 سال قبل پیدا ہوا۔ سٹاگرہ ایتھنز سے دو سو میل دور شمال میں تھریس (Thrace) کے قریب ایک بندرگاہ تھی جہاں ارسطو یونانی تاریخ کے اس پر آشوب دور میں پیدا ہوا جب اپنے دور کے عظیم شخص اور ہر دور کے عظیم فلسفی سقراط کو زہر پیئے پندرہ سال اور آسمان فلسفہ کے درخشندہ ستارے افلاطون کو درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیے دو سال گزر چکے تھے۔

ارسطو کے والد کا نام نکومیکس (Nicho-Machus) تھا' جو سکندر اعظم کے دادا امینتاس (Amyntas)' جو اس وقت مقدونیہ پر حکمرانی کر رہا تھا' کا دوست اور ذاتی معالج تھا۔ اس کی والدہ کا نام فالیس تھا' جو یونان کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ارسطو ابھی لڑکپن کی عمر میں تھا کہ اس کا باپ فوت ہو گیا اور وہ اپنے ایک بزرگ پروکی نکس (Proxinux) کی سرپرستی میں سترہ سال کی عمر تک سٹاگرہ میں مقیم رہا۔

ارسطو نے طب کی فضا میں پرورش پائی اور اسی ماحول نے اسے حیاتیات اور سائنس کی طرف راغب کیا۔ اس نے طبابت اور جراحی کی ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی اور جب وہ سترہ سال کا ہوا تو اس کے سرپرست پروکی نکس نے اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایتھنز بھیج دیا' جہاں اس وقت افلاطون کی اکیڈیمی کا بڑا چرچا تھا۔ ارسطو 368 ق م میں افلاطون کی اکیڈیمی میں داخل ہوا۔ اس وقت افلاطون کی عمر 61 سال تھی اور وہ اخلاقیات' علمیات' طبیعیات اور سیاسیات پر مشتمل نظامِ فکر اور مثالی مملکت کے قیام کے لیے کوشاں تھا۔

ارسطو اپنی ذہانت و بلاغت اور قابلیت کی بنا پر اپنے استاد کے انتہائی قریب ہوگیا۔ ارسطو کے مطابق افلاطون واحد شخص تھا جس نے اپنی علمی زندگی اور تحریری قوت استدلال سے نیکی کو منبع و مسرت و شادمانی قرار دیا۔ افلاطون بھی سمجھ چکا تھا کہ اس کا شاگرد ذہنی عظمت کا مالک اور عقل مجسم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اسے اپنے تمام شاگردوں پر ترجیح دیتا تھا حالانکہ ان میں ہیراکلائڈز' افلیوس' ہیٹوس اور مینڈیموس جیسے نامور لوگ شامل تھے جنہوں نے فیثاغورث کے نظریات کو حتمی شکل دینے کی کوشش کی۔ ہیراکلائڈز نے 339 ق م میں ایک الگ مدرسہ قائم کرکے ان نظریات کا پرچار کیا کہ "الٰہی عقل نے کائنات کو نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنایا ہے' زمین اپنے گرد گھومتی ہے اور روح ایتھری مادے سے بنی ہے۔" جبکہ ہیٹوس کے مابعد الطبیعیاتی اور ریاضیاتی نظریات ارسطو کے خیالات میں ہمیشہ محفوظ رہے۔ ارسطو نے اکیڈیمی میں علم حاصل کرنے کے شوق کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ وہ رات گئے تک چراغ کی روشنی میں مطالعہ کرنے والا طالب علم تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں فلسفہ پر عبور حاصل کرلیا اور کثیر سرمایہ خرچ کرکے بے شمار قلمی نسخے خریدے۔ اس نے اپنے گھر کو کتب خانہ میں تبدیل کرکے کتابوں کی ترتیب کی بنیاد رکھی۔ اس کی پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اور اسی بنا پر افلاطون اس کے گھر کو دارالقاری کہا کرتا تھا۔ ارسطو افلاطون کی اکیڈیمی سے بیس سال تک منسلک رہا اور

اس دوران اس نے افلاطون سے حیاتیات' سیاسیات' اخلاقیات اور الہیات کا علم حاصل کیا۔ وہ افلاطون کی زندگی میں ہی علم فلسفہ میں غیر معمولی مہارت کے باعث پورے یونان میں مشہور ہوچکا تھا اور افلاطون اسے "عاقل" کے نام سے پکارتا تھا۔ ارسطو کی افلاطون کے ساتھ بیس سالہ رفاقت نے ارسطو کے فلسفہ پر گہرا اثر ڈالا۔ میکلمن (Maclmain) کے مطابق "ارسطو کی افلاطون کے ساتھ رفاقت ایک ایسا امر ہے جس نے ارسطو کے فلسفہ کو خاص شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔" فاسٹر کے مطابق "ارسطو سب سے زیادہ افلاطونیت کا پیروکار ہے اور جس قدر ارسطو افلاطون سے متاثر ہوا تھا اس طرح کوئی بھی دوسرا عظیم فلسفی کسی دوسرے کے خیالات سے متاثر نہیں ہوسکا۔" پروفیسر سبائن کے مطابق "ارسطو کے سیاسی فلسفہ کے نظریات کی بنیاد افلاطون کے ساتھ اس کی بیس (20) سالہ رفاقت پر منحصر ہے۔"

افلاطون کی زندگی کے آخری ایام میں اکیڈیمی کی سربراہی کے لیے جھگڑا پیدا ہوا۔ ارسطو کی خواہش تھی کہ وہ اپنے استاد کے بعد اس اکیڈیمی کا سربراہ بنے اور اپنے استاد کے کام کو آگے بڑھائے لیکن 347 ق م میں افلاطون کی موت کے بعد افلاطون کی خواہش اور وصیت کے مطابق اس کا بھتیجا سپیسی پس (Speusippus) جو ریاضیاتی اعداد کا قائل اور اکائی کو تکوینی عقل اور خیر مطلق سے الگ تصور کرتا تھا اکیڈیمی کا سربراہ بنا جس پر ارسطو دل برداشتہ ہو کر ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا۔ ارسطو کے دوستوں میں اٹارنس کا حکمران ہرمیاز (Hermeias) بھی شامل تھا۔ لہٰذا وہ اپنے ایک اور دوست اکینوکریٹز (Xenocrates) جو بعد میں 313 ق م تک افلاطون کی اکیڈیمی کا سربراہ رہا اور اکائی اور دیوتا زیوس کو ایک سمجھتا تھا کے ہمراہ 347 ق م میں اٹارنس پہنچا اور ہرمیاز کے دربار سے منسلک ہوا۔ اس نے اٹارنس میں ہرمیاز کی بھتیجی پی تھی اس (Pythias) سے شادی کی اور بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری۔ ارسطو نے اپنی زندگی کے آخری دور میں دوسری شادی

بھی کی تھی۔ دوسری بیوی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام دادا کے نام پر نیکومیکس رکھا گیا۔ تین سال بعد جب ہرمیاز سے سلطنت چھن گئی تو ارسطو میلین چلا گیا۔ پھر ایتھنز واپس آیا اور وہاں ایسوکرائیس کی مخالفت میں خطابت (Rhetoric) کا مدرسہ کھولا۔

342 ق م میں مقدونیہ کے حکمران فلیفوس نے اسے اس کی قابلیت اور خاندانی دیرینہ مراسم کی بنا پر متی لین (Mytilene) سے طلب کر کے اپنے بیٹے سکندر اعظم کا اتالیق مقرر کیا۔ اس وقت سکندر اعظم کی عمر تیرہ سال اور ارسطو کی عمر 38 سال تھی۔ ارسطو مقدونیہ میں سکندر اعظم کا پانچ سال تک اتالیق رہا اور سکندر اعظم نے اس کی شاگردی میں علوم و فنون میں دسترس حاصل کی۔ اس دوران فیلفوس نے ارسطو کو فلسفیانہ اور سائنسی تعلیم کے لیے بہترین سہولیات فراہم کیں۔ پلوٹارک کے مطابق سکندر اعظم ارسطو کو اپنے باپ جیسا احترام دیتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ

"باپ نے مجھے زندگی دی اور استاد نے مجھے جینے کا فن بتایا۔
کیا ہی بہتر ہوتا اگر اقتدار میں وسعت کی بجائے میرے علم میں
وسعت پیدا ہوتی اور میں نیکی کو پہچان سکتا۔"

338 ق م میں سکندر اعظم کے باپ فیلفوس نے کیرونیا کے مقام پر ایتھنز والوں کو شکست دے کر یونان کو متحد کرنے کی کوشش کی لیکن اس فتح کے فوراً بعد ہی اسے ہلاک کر دیا گیا۔ اس طرح سکندر اعظم فلسفہ کو خیرباد کہہ کر تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ یہ ارسطو کی تعلیم و تربیت کا ہی اثر تھا کہ سکندر اعظم مقدونیہ کی ایک چھوٹی سی بستی سے نکل کر دنیا کے ایک بڑے حصے کا فاتح بنا۔ ارسطو نے سکندر اعظم کی راہنمائی کے لیے تین چھوٹے چھوٹے مقالے On Coloseis of Kingship کے عنوان سے تحریر کیے اور ان کا انتساب سکندر اعظم کے نام پر کیا۔ سکندر نے اگر دنیا کو فتح کیا تو ارسطو نے تسخیر کائنات کا

کارنامہ سرانجام دیا اور یہ دونوں استاد شاگرد اپنے اپنے مقاصد میں کامیاب و کامران رہے۔

بعض ہندو مورخین کے مطابق دنیا کے دو عظیم فاتح و فرماں روا سکندر اعظم اور چندر گپت موریہ کے دو عظیم اتالیق ارسطو اور کوتلیہ چانکیہ کا دور اتالیقی' دور حکومت اور دور تصانیف مشترک اور یکساں ہیں۔ مقدونیہ میں سکندر اعظم اور ٹیکسلا میں چندر گپت موریہ نے ایک ہی زمانہ میں دنیا کے عظیم دانش ور اور ماہرین علوم سیاسیات بالترتیب ارسطو اور کوتلیہ چانکیہ سے تعلیم و تربیت حاصل کی جس کے باعث دنیا کے یہ دونوں عظیم فاتحین تاریخ کا نمایاں باب بنے۔ ہندو مورخین کے نزدیک "ارتھ شاستر" کے مصنف کوتلیہ چانکیہ اور ارسطو کے نظریات مشترک ہیں اور ارسطو کے یہ نظریات کہ "مستحکم جاسوسی نظام قائم کیا جائے جس میں عورتیں بالخصوص جاسوس ہوں' ملک کے باغیوں کو سخت ترین سزائیں دی جائیں' عوام اور حکومت کے درمیان اعتماد اور مفاہمت کا جذبہ بھرپور طور پر قائم ہو' ریاست میں بھائی چارہ کی فضا قائم ہو' طاقت یا خوف کے ذریعے حکومت قائم نہ کی جائے اور حق شہریت میں فرق روا رکھا جائے۔" چانکیہ کے نظریات سے متشابہ ہیں۔(کوتلیہ چانکیہ کے حالات زندگی اور فلسفہ سیاست جاننے کے لیے میری کتاب "عظیم سیاسی مفکرین عالم" کا باب "کوتلیہ چانکیہ" ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔)

سکندر اعظم 336 ق م میں یونان کا بادشاہ بنا اور اپنی عالمی فتوحات کے بعد 323 ق م میں وفات پا گیا جبکہ چندر گپت موریہ چانکیہ سے آٹھ سال تک میٹھی سیاست کے گر سیکھنے کے بعد حکمران بنا اور ایک مستند روایت کے مطابق 298 ق م میں تخت چھوڑ کر جینی مذہب کا بھکشو بن کر دکن چلا گیا۔ ارسطو کی اتالیقی کا دور چھ سال ہے جبکہ کوتلیہ چانکیہ کا دور اتالیق 28 سال ہے۔ ارسطو نے 322 ق م میں وفات پائی اور یہی سال پاٹلی پتر میں چندر گپت موریہ کے شہنشاہی قائم ہونے کا ہے۔

سکندر اعظم کے فوجی مہمات میں مصروف ہونے پر ارسطو نے 334 ق م میں

ایک استاد کامل کی حیثیت سے لائیسم (Lysium) کے مقام پر افلاطون اکیڈیمی کی طرز پر ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جو بعد میں ارسطو کے چل پھر کر پڑھانے کی وجہ سے مکتبہ مشائین کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مدرسہ میں طلباء کی تعداد اس قدر تھی کہ مدرسہ کے انتظام و انصرام کے لیے پیچیدہ اور مشکل قواعد و ضوابط بنانے پڑے اور ہر دس روز بعد ایک نئے طالب علم کو مدرسے کی کارروائی کی نگرانی پر مامور کیا جاتا تھا۔ اتنے سخت قواعد و ضوابط کے باوجود طلباء استاد کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے اور ورزشی میدان میں ٹہلتے ٹہلتے علم حاصل کرتے تھے۔ اس مدرسہ میں ریاضیات' فلسفہ' سیاسیات اور فکر آرائی کے علاوہ علم الحیات اور علوم طبعی بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن طلباء کا زیادہ تر رجحان علم الحیات اور علوم طبعی کی طرف تھا۔ ارسطو نے ایشیا کے ہر خطہ سے حیوانات اور نباتات کے نمونے حاصل کیے اور دنیا کی تاریخ میں پہلا عظیم الشان چڑیا گھر قائم کیا' جس کے قیام کے لیے پلینی اور ایتھیوس کے مطابق سکندر اعظم اور مملکت نے اسے وسائل فراہم کیے تھے۔

ارسطو بارہ سال تک اس ادارہ کا سربراہ رہا اور اس دوران اس نے بہت سے تحقیقی اور تخلیقی کاموں کی مختلف شاخوں کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ اس علم کثیر کو حتمی شکل میں مرتب بھی کیا۔ ارسطو نے سائنس کی ترقی کے لیے جو مواد مہیا کیا وہ بلاشبہ انسانی ذہن کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اس نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے دور کے سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کی تصحیح کی۔ اس نے منطق' مابعد الطبیعیات' اخلاقیات' سیاسیات' فنون لطیفہ' فلکیات اور جانوروں کی زندگی پر مقالات تحریر کیے۔ وہ حیوانیات اور منطق کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ منطق میں اس نے استقراری اور استخراجی دونوں اصولوں کو اپنایا۔ اس نے ادب میں ہومر اور ہیزی روڈ کے نظریات و خیالات سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے کہا کہ "اگر ہم حسن و خوبصورتی کے متمنی ہیں تو ہمیں ادب اور فنون کا راستہ اختیار کرنا چاہیے لیکن اگر ہم مادی اور ٹھوس حقائق کے متمنی ہیں تو پھر ہمیں سائنس اور عقلی استدلال کا

راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

ارسطو نے بعض تصورات میں اپنے استاد افلاطون سے اختلاف کیا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو افلاطون کے مکتبہ فکر کا رکن سمجھتا تھا اور اسی باعث بحیثیت مجموعی ان دونوں کے فلسفے میں اختلاف کی نسبت اتفاق زیادہ پایا جاتا ہے۔ فلسفے کو حکمت تک محدود کرنے اور اخلاقی فعلیت کو متمیز کرنے کے باوجود ان دونوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ارسطو بھی افلاطون کی طرح اشیاء کے جواہر اور غیر متغیر وجود کے علم جس میں کلیت اور لزوم موجود ہو حاصل کرنے پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "اشیاء کا اصل جوہر ان صور پر مشتمل ہے جو ہمارے تصورات کا موضوع ہیں۔" ارسطو نے سقراط اور افلاطون کے علم تصورات کو استقرا اور منطقی استدلال دونوں لحاظ سے معراج کمال تک پہنچایا۔ اس کی تحریروں میں اگرچہ افلاطون کا حسابی فن لطیف شامل نہیں ہے لیکن اس کا بیان جلد دلنشین ہو جاتا ہے۔ ارسطو نے اپنی تحریروں میں جو فلسفیانہ مصطلحات استعمال کی ہیں وہ لاجواب ہیں۔

ارسطو کا پیش کردہ اخلاقی اور سائنسی نظام افلاطون کے نظام سے ملتا جلتا ہے اور اس کی تمام تحریروں پر افلاطون کا انداز چھایا ہوا ہے اس کی تحریروں میں افلاطون سے اختلاف اور اتفاق دونوں موجود ہیں لیکن اختلاف سطحی ہیں جبکہ نظریات میں ہم آہنگی گہری بنیادوں پر ہے۔ افلاطون خیال یا تصور کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے جبکہ ارسطو حواس خمسہ سے محسوس ہونے والے جہاں کو اصل حقائق کا جہاں کہتا ہے۔ افلاطون نے اپنے فلسفے میں متھ کا سہارا لیا ہے جبکہ ارسطو نے سائنسی موضوعات کے بیان میں متھ اور شاعرانہ تساہل نگاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ارسطو افلاطون کی آخری تصنیف "The Laws" سے نہ صرف متاثر تھا بلکہ اس نے جو ایک حقیقی اور قابل عمل مملکت کا ڈھانچہ متعین کیا ہے وہ کم و بیش انہیں اصولوں پر مبنی ہے جو افلاطون نے The Laws میں اپنی عملی مملکت کے استحکام کے لیے پیش کیے تھے۔

افلاطون کے خیال میں "تخلیق کائنات کا مبداء واحد کوئی نہ کوئی نفس، روح، خدا یا مطلق وجود ہے، یہ مظہری دنیا اصل اور حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ ہر ہر لمحہ تغیر و تبدل کے عمل سے گزرتی ہے اور یہاں عروج و زوال اور موت و زیست کا لامتناہی سلسلہ جاری و ساری ہے۔ یہ کائنات عمومی طور پر اپنے اصل کی نقل ہے اور ہر مظاہرات فطرت کا عین مطلق عالم بالا یا عالم مقام میں موجود ہے جو غیر متبدل اور غیر فانی ہے" جبکہ ارسطو کے خیال میں" مادہ ہی بنیادی طور پر اپنی اصل میں حقیقت اولیٰ ہے اور یہ مادی دنیا ہی اپنی جگہ حقیقی اور ابدی ہے یہ اپنی اصل میں کوئی نقل نہیں بلکہ اپنی وجودی ہیت میں اصل ہے۔ مظاہرات کائنات محض افراد کے ذہن میں موجود تصورات کا عکس ہی نہیں بلکہ انسانی ذہن کے تصوراتی مشاہدے سے ہٹ کر بھی یہ اپنا وجود رکھتے ہیں جس کو حواس خمسہ کے ذریعے محسوس کیا جاسکتا ہے"۔ ارسطو افلاطون کے فلسفہ روحانیت کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "انسان ایک حیاتیاتی وجود ہے جو نہایت ہی اعلیٰ قسم کے اعصابی نظام اور ایک معاشرتی مزاج کا حامل ہے۔ ذہن یا روح دراصل عضویہ کا ایک اعلیٰ اور پیچیدہ فعل کا نام ہے۔ محض خیالات کی بنیاد پر کائنات کے مادی وجود اور خود انسان کے حیاتیاتی وجود کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی، تاوقتیکہ ان عناصر کی حقیقت کا اپنے حواس اور معروضی مشاہدے کی بنیاد پر یقین نہ کر لیا جائے۔ بلاشبہ عقل کسی حد تک کائنات اور مظاہرات کی حقیقت تک انسان کی راہنمائی کرتی ہے لیکن مکمل طور پر حقیقت تک رسائی کے لیے عقل پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر انسان عقل کے ساتھ ساتھ اپنے حواس اور مشاہدے کو بھی بروئے کار لائے تو حقیقت آشکار ہو سکتی ہے۔"

افلاطون نے اپنے تصور اشتمالیت میں معاشرے میں عدم استحکام، انتشار اور اخلاقی برائیاں ختم کرنے کے لیے نجی ملکیت اور خاندان جیسی رکاوٹیں دور کرنے کا تصور پیش کیا جس کا مقصد عمومی معاشرہ کی اصلاح تھا۔ ارسطو اس تصور اشتمالیت پر

تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "چونکہ اس تصور کے مقاصد اور ذرائع کے درمیان ہم آہنگی نہیں پائی جاتی اس لیے یہ قابل اطلاق نہیں ہے۔" اس کے نزدیک اس تصور اشتمالیت کے مقاصد اخلاقی ہیں جبکہ ان کے حصوں کے لیے اخلاقی ذرائع کی بجائے مادی ذرائع استعمال کیے گئے ہیں جس کے باعث اس تصور میں منطقی تضادات پیدا ہوئے اور مطلوبہ مقاصد کے حصول میں ناکامی ہوئی۔ ارسطو کے نزدیک نجی ملکیت اور خاندان کو حکمران اور فوجی طبقے کے لیے ممنوع قرار دینے کا طرز عمل مملکت میں اتحاد کی بجائے نفاق اور انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔

ارسطو کے خیال میں تصور اشتمالیت کے نفاذ سے معاشرے میں بیک وقت دو طبقے معرض وجود میں آئیں گے جن میں سے ایک طبقہ مادی وسائل پر قابض جبکہ دوسرا طبقہ دولت و خاندان سے محروم ہوگا اور اسی محرومی سے بالآخر معاشرہ طبقاتی تصادم کے باعث انتشار و بدنظمی کا شکار ہوگا۔ معاشی طبقے کے مرضی کی پالیسیاں بننے سے مملکت کے تمام امور میں معاشی طبقے کا عملی عمل دخل ہوگا اور اس طرح ہر طبقہ اپنے دائرہ کار میں رہ کر متعینہ فرائض سرانجام نہیں دے سکے گا۔ ارسطو کے نزدیک تصور اشتمالیت میں حکمرانوں کے لیے خاندان اور نجی ملکیت ممنوع قرار دے کر مجرد زندگی گزارنے کا درس دیا گیا ہے جن سے وہ انسانی جذبات و احساسات سے عاری ہوں گے اور اس حالت میں ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ وہ عمومی طور پر معاشرے کی اصلاح کریں اور دیگر طبقات کی مرضی کی پالیسیاں وضع کریں۔ اس کے خیال میں حکمرانوں اور فوجیوں کو صرف عقل کے بل بوتے پر زیادہ بہتر کام کرنے کی توقع خلاف فطرت ہے۔ اگر انسان عقل اور جذبے کے ساتھ ساتھ دیگر احساسات کو بھی بروئے کار لا کر معاشرے میں تعامل کرے تو زیادہ کامیاب رہ سکتا ہے۔ اس کے خیال میں مملکت اور خاندان دونوں ادارے اپنے مقاصد، دائرہ کار، وسعت اور فرائض کے اعتبار سے بالکل جدا جدا ہیں۔ خاندان اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایک منفرد ادارہ ہے جس کی خصوصیات اور جملہ تشکیلی عناصر کو مملکت کی جانب تبدیل

نہیں کیا جاسکتا۔ مزید خاندان کی شفقت و محبت کو پھیلا کر مملکت کے دائرہ کار تک بسیط کر دینا اور اس میں خاندان کی سی خصوصیات پیدا کرنا اور خاندانی ماحول و کیفیت پیدا کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اس لیے مملکت کو خاندان سے تشبیہ دینا افلاطون کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اس کے مطابق افلاطون نے اپنے اس تصور میں مرد اور عورت کے باہمی ملاپ کے حیاتیاتی تصور کو محو کر دیا ہے اور اشتراک ازواج کے تصور میں اخلاقی ضابطوں اور اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا ہے۔ ارسطو افلاطون کے تصور اشتراک ازواج پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر مملکت کو اشتراک ازواج کی بنیاد پر ایک خاندان تسلیم کر لیا جائے تو اس میں بہت ساری اخلاقی برائیاں پیدا ہو جائیں گی اور اس بات کی تمیز کرنا مشکل ہو جائے گی کہ کون کس کا باپ اور کون کس کا بیٹا ہے اور اس طرح معاشرتی رشتوں اور قدروں کی اہمیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اولاد کی پیدائش اور ان کی تربیت کا کام عورتیں پورے معاشرے کے لیے انجام دینے سے گریز کریں گی۔ آیئے ارسطو کی شخصیت کو اس کے فلاسفہ کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔

# ارسطو کی شخصیت

فلسفہ سیاسیات میں ارسطو کا مقام اور حیثیت امتیازی ہے۔ تاریخ میں اسے موجد سیاسیات، مفکر اول سیاسیات اور بابائے سیاسیات کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی تصنیف "سیاسیات" کو علم سیاسیات اور فن حکومت پر ایک مستقل مقالہ کی حیثیت حاصل ہے جس کی وجہ بیان کرتے ہوئے پروفیسر ڈیننگ (Prof. Dunning) لکھتا ہے کہ "سیاسی فکر کی تاریخ میں ارسطو کی حیثیت کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس نے علم سیاسیات کو ایک خودمختار اور الگ علم کی حیثیت دی ہے۔ وہ پہلا سیاسی مفکر ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار سیاسیات اور اخلاقیات کے درمیان تمیز پیدا کی اور سیاسیات کو ایک خودمختار علم کی حیثیت دینے کے لیے استقراری طریقہ مطالعہ باضابطہ اور واضح طور پر استعمال کیا۔ وہ واحد فلسفی ہے جس نے معلوم تاریخ میں پہلی دفعہ نہ صرف علم سیاسیات کی جداگانہ حیثیت قائم کی بلکہ مختلف سیاسی ادارت سے متعلق تصورات پیش کر کے فلسفہ سیاسیات میں اپنے لیے ایک منفرد مقام حاصل کیا۔"

ارسطو نے افلاطون کے فلسفہ مثالیت کے ردعمل میں فلسفہ حقیقت پیش کیا جس میں اس نے افلاطون کے اس نظریہ کو کہ "موجودہ مادی دنیا حقیقی نہیں بلکہ یہ

اس حقیقی کائنات کا عکس ہے جو ماورائے کائنات میں کہیں موجود ہے اور انسانی مشاہدہ و حواس سے ماورا ہے" کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ "مادی دنیا اپنی ہیئت میں ہی حقیقی دنیا ہے اور ماورائے کائنات کسی کائنات کا وجود نہیں ہے۔" ارسطو نے کائنات کو ایک اصل اور ٹھوس ابدی حقیقت قرار دیتے ہوئے کہا کہ "ہم اپنے حواس کے ذریعے نہ صرف اس کا مشاہدہ کرسکتے ہیں بلکہ اس کے موجودات کو اپنی تمدنی زندگی کی تکمیل کے لیے بروئے کار بھی لاسکتے ہیں۔" اس نے افلاطون کے اس خیال کی کہ "تخلیق کائنات کا مبداء واحد کوئی نہ کوئی نفس، روح، خدا یا مطلق وجود ہے" کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ "مادہ بنیادی طور پر اپنی اصل میں حقیقت اولیٰ ہے اور مادی دنیا ہی اپنی جگہ بڑی حقیقت ہے۔" اس نے افلاطون کے نظریہ روحانیت کو بھی قبول نہ کیا اور کہا کہ "انسان ایک حیاتیاتی وجود ہے، جو نہایت ہی اعلیٰ قسم کے اعصابی نظام اور ایک معاشرتی مزاج کا حامل ہے اور ذہن یا روح دراصل عضویہ کے ایک اعلیٰ اور پیچیدہ فعل کا نام ہے۔" ارسطو کے نزدیک کائنات میں ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون موجود ہے جس کو دلیل کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے اور جس کا اطلاق افراد پر بطور عاقل انسانوں کے ہوتا ہے۔

اسی فلسفہ حقیقت کی روشنی میں ارسطو نے تاریخ میں پہلی بار پڑوسی ممالک کے سیاسی نظاموں کا ایتھنز کے مروجہ نظام اور اس کے جملہ ادارت کا معروضی تجزیہ کرکے معاشرے کے مختلف سماجی و سیاسی ادارت سے متعلق نہ صرف قابل اطلاق تصورات پیش کیے بلکہ مختلف سماجی اور بنیادی علوم میں نئے اضافے بھی کیے۔ اس نے انسان کو سیاسی حیوان قرار دیتے ہوئے کہا کہ "یہ انسانی خواہش کے عین مطابق ہے کہ اس کی انفرادی شخصیت اور اجتماعی زندگی کی تکمیل ایسے مقتدر سیاسی اداروں کے ذمہ ہوں جو اپنی ہمہ گیریت اور دائرہ کار و وظائف کے حوالے سے فرد کی شخصیت پر مکمل طور پر حاوی ہوں اور ہر سیاسی ادارہ بشمول مملکت، حکومت، قانون، آزادی و شہریت کی اساس جو بلاشبہ انسانی حواس اور مشاہدہ فراہم کرتی ہے

معروضی ہونی چاہیے۔" اس طرح ارسطو نے پہلی دفعہ مختلف سیاسی مسائل کا حل اور سیاسی ادارت کی تشکیل کے لیے تصورات پیش کرتے وقت استقراری طریقہ مطالعہ کو بروئے کار لاکر ٹھوس نتائج اخذ کئے اور عمرانی علوم کے مطالعے میں نئے باب کا اضافہ کیا۔

ارسطو نے آغاز مملکت کا تصور پیش کرتے وقت استخراجی اور مقصدیت کے طریقہ ہائے مطالعہ سامنے رکھے اور اس طرح استقراری مطالعہ کے بغیر مملکت کی تشکیل میں ایسے عناصر کو شامل کیا جن کی افادیت و اہمیت آج بھی مسلمہ ہے۔ اس نے تصور آغاز مملکت میں مملکت کے ارتقاء کو فطری مملکت کی تشکیل میں خاندان کو ابتدائی اکائی اور مملکت کو انسانی ضروریات کا واحد ادارہ قرار دے کر ایک قابل قدر اور قابل تحسین کام کیا۔

ارسطو نے تقسیم مملکت کے افادی پہلو پر بحث کرتے ہوئے دو اصول بیان کئے۔ اس کے نزدیک حکمران طبقے کا اصول افادی ہے اور سماجی طبقے کی نوعیت کا اصول قابل قبول ہے۔ بلاشبہ موجودہ دور کی جدید مملکتیں اس کے اس اصول کو کہ "حکمران طبقے کے مقاصد کا اصول افادی ہے۔" اپنا کر سیاسی نظام مرتب کر رہی ہیں جبکہ اس کے سماجی طبقے کا اصول مملکت کی نوعیت کے تعین کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ یہ ارسطو کی فکری گہرائی کی انتہا ہے کہ اس نے اپنے تصور تقسیم مملکت میں آنے والے دور کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا۔

ارسطو کا تصور شہریت اگرچہ موجودہ حالات سے مطابقت نہیں رکھتا ہے لیکن پھر بھی اس کے تصور شہریت کے کچھ اصول اور شرائط آج بھی انتہائی اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں۔ اس کے تصور شہریت میں نہ صرف قدیم یونانی معاشرتی اور سیاسی زندگی کے تمام رنگ موجود ہیں بلکہ اس نے مستقبل کے تقاضوں کو بھی کسی حد تک مد نظر رکھا ہے۔ ارسطو کے تصور شہریت میں عدالتی، قانونی اور انتظامی فرائض کی بجا آوری ہی شہریت کی لازمی شرط ہے۔ اس کا یہ تصور اخلاقی اقداروں،

اصولوں اور ضابطوں پر استوار ہے جس سے شہریوں کی سیاسی اقتدار میں بالواسطہ شراکت کا تصور ملتا ہے جو جدید تصور شہریت سے زیادہ افادی اور بامعنی ہے۔

ارسطو پہلا مفکر ہے جس نے تفکری مشکلات کے باوجود یہ اصول وضع کیا کہ "طرز حکومت کا انحصار بہت حد تک کردار زر اور تقسیم زر پر مبنی ہے۔ لوگوں کے پیشے ان کی سیاسی اہلیت اور رویہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انقلاب کا بنیادی سبب اس باہمی دوڑ کا نتیجہ ہے جو کثیر دولت والوں' کم دولت والوں اور مفلسی کے ماروں کے درمیان ہوتی ہے۔" سبائن کے مطابق ارسطو قانون کی حکمرانی تسلیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جو قانون کی حاکمیت پر یقین رکھتے ہیں وہ اصل عقل و دانش کی حاکمیت پر یقین رکھتے ہیں اور جو انسانی راج پر یقین رکھتے ہیں وہ حکمرانی میں وحشت کا عنصر بھی شامل کر دیتے ہیں۔ نفس سب سے بڑا وحشی درندہ ہے اور نفس کی وجہ سے پیدا ہونے والے جذبات انسانی اذہان کو بے راہرو کر دیتے ہیں خواہ انسان صفات کے لحاظ سے اشرف ہی کیوں نہ ہو۔"

ارسطو ایک ایسا حقیقت پسند' تجزیہ پسند اور منطقی ہے جو سیاسیات کو صرف مثالی ریاست تک محدود نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اس کے دائرہ کار کو وسیع کر کے ان ریاستوں کا مطالعہ کرنا ضروری قرار دیتا ہے جو حقیقی وجود رکھتی ہیں۔ اس کے خیال میں علم سیاسیات کو اچھی اور بری دونوں طرح کی ریاستوں پر حکومت کرنے کا فن سکھانا چاہیے۔ اسی لیے وہ کسی بھی نظریہ کو پیش کرنے سے قبل ہمعصر سیاسی اداروں کا بغور مشاہدہ کرتا اور مطالعہ کے لیے سائنسی اور منظم طریقہ سے مواد اکٹھا کرنے کے بعد ایک نیا نظریہ دریافت کرتا تھا۔ اسی باعث اسے یونانی دنیا کی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا مانا جاتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب سیاسیات لکھنے سے قبل ستاون مختلف آئینوں کا مطالعہ کیا اور ان کی روشنی میں علم سیاسیات میں نئی راہیں متعین کیں۔

ارسطو نے اپنے دور کے معاشرتی ڈھانچے کے مروجہ خدوخال کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی کو ان کے جملہ ادارت کے ساتھ جوں کا توں رکھ کر ایک

قدامت پسند مفکر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ تصور غلامی میں بھی وہ حقیقت پسند فلسفی کی بجائے قدامت پسند مفکر نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرتی ڈھانچہ میں تبدیلی یا خالص شعبہ میں انقلابی تبدیلی دونوں صورتوں میں معاشرتی عدم استحکام پیدا ہوتا ہے اور تقریباً یہ طرز فکر اس کے تمام تصورات پر حاوی ہے۔ اس نے نہ صرف خاندانی، نجی ملکیت اور دیگر نظام ہائے زندگی کو ویسے ہی برقرار رکھا بلکہ غلامی کے مروجہ نظام کو بھی برقرار رکھنے کے لیے مختلف دلائل اور تجاویز پیش کیں۔ اس کے نزدیک" غلامی کا ادارہ بھی مملکت کا ایک جزو ہے جو معاشرے کے عمومی استحکام کے لیے سرگرم عمل ہے۔ غلام مالک کا آلہ کار اور گھریلو زندگی کا ایک جزو ہے، غلامی فطری اور انصاف پر مبنی ہے، آقا کی حیثیت روح اور غلام کی حیثیت جسم کی سی ہے۔" ارسطو کے تصور غلامی میں بلاشبہ منطقی تضادات موجود ہیں اور یہ تصور انسانی اقدار سے متصادم ہے۔

ارسطو وہ واحد شخصیت ہے جس نے نہ صرف ایک مستقل سائنس کو تخلیق کیا بلکہ اس کی مختلف جزئیات اور تفصیلات پیش کر کے اس کو پایۂ تکمیل تک بھی پہنچایا۔ ارسطو کے نزدیک تفکر کا دار و مدار استدلال یا سائنسی ثبوت پر ہے۔ اس کے مطابق "سائنسی علم کے تمام نظام کی بنیاد دراصل چند بدیہی حقائق (Self Evident) پر ہے، یہ چند بنیادی صداقتیں خود ہی اپنا ثبوت ہوتی ہیں اور ان کو ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔" اس کے نزدیک ہر شے کا کوئی نہ کوئی مقصد اور نصب العین ہے۔

ارسطو کا ذہنی رجحان افلاطون سے مختلف رہا۔ ان دونوں کے نقطہ نظر اور انداز فکر میں واضح فرق موجود ہے۔ افلاطون علم کو تصوف، روحانیت اور مابعد الطبعیات سمجھتا ہے جبکہ ارسطو نئے نئے تجربوں اور نئی نئی معلومات کے ذریعے علم کو فروغ دیتا ہے۔ افلاطون نے انسانی ضمیر کو جگایا جبکہ ارسطو انسانی دماغ کو بیدار کرنے میں کامیاب رہا۔ افلاطون نے اپنی تصانیف میں یونانی روحانی خیالات کو یکجا کیا جبکہ

ارسطو نے یونانی علوم کو مرتب کرنے کے علاوہ علم کے موضوع متعین کیے اور آئندہ نسلوں کو ترقی کا راستہ دکھایا۔ افلاطون سیاسی عینیت کا علم بردار تھا جبکہ ارسطو سیاسیات کا بانی اور ہر دور کا امام اور راہنما مانا جاتا ہے۔ نظری سیاسیات میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ پہلا سیاسی مفکر ہے جس نے جمہوریت کو بہترین طرز حکومت اور جمہور کی رائے کو بہتر رائے قرار دیا۔ اس کے اس نظریہ سے نظریہ تقسیم اخذ کیا گیا اور مقننہ۔ انتظامیہ اور عدلیہ کی آزادی کو ایک اچھی اور بہتر حکومت قرار دیا گیا۔ وہ انفرادی آزادی کو قانون کے تابع اور آزادی اور اقتدار کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے جو اس کے کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔ وہ ایک سچا یونانی تھا اور یونانیوں کو اعلیٰ اور مہذب ترین قوم سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے غیر یونانی مملکتوں کے دستوروں پر قطعاً" غور نہیں کیا۔ ارسطو کے سیاسی فلسفے کی اہمیت اس حقیقت سے اجاگر ہوتی ہے کہ آج تک دنیا میں ایسا کوئی مستند سیاسی نظریہ اور نظام موجود نہیں ہے جس میں اس کے سیاسی فلسفہ کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو۔ اتیان کے مطابق سقراط نے بنی نوع انسان کو فلسفہ دیا اور ارسطو نے یہ فلسفہ سائنس کو دے دیا۔ ارسطو کے نزدیک معاشی وجوہات سیاسی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں اور بالآخر انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے مملکت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مسلمہ حقیقت کے پیش نظر کسی فرد یا گروہ کو دولت اکٹھا کرنے کا موقع نہ دے۔

ارسطو کی نظر میں مملکت کے قیام کا اصل مقصد "اچھی زندگی" گزارنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ" انسان ایک سیاسی اور سماجی کیڑا ہے۔ فطری طور پر تنہا نہیں رہ سکتا اسے معاشرے اور ریاست کی مدد کی ضرورت رہتی ہے۔ ریاست کا وجود ایک قدرتی وجود ہے جو فرد کی انفرادی اور معاشرے کی اجتماعی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ مملکت ایک قدرتی ادارہ ہے۔ مملکت ایک مرکب ہے اور اس کے اجزاء کو تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مملکت دراصل ان لوگوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کے

بغیر زندگی نہیں گزار سکتے۔ جیسے حاکم اور محکوم۔ حکومت ایک فطری اصول ہے۔ حاکم غور و فکر اور حکم دینے کی اہلیت رکھتا ہے جبکہ محکوم میں جسمانی محنت و مشقت کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ یہ اتحاد ایک فطری تقاضا ہے اور اس فطری تقاضا کے باعث مرد اور عورت کا وجود قائم ہوتا ہے۔ جس سے خاندان بنتے ہیں۔ چند خاندانوں کے اکٹھا ہو جانے پر گاؤں اور چند گاؤں متحد ہو کر سیاسی تنظیم کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ جن کی بنیادی ضرورتیں مملکت کے وجود کا باعث بنتی ہیں۔ اس مملکت کے آغاز و ارتقاء کا سلسلہ فطری اور اس کی بنیاد اخلاق پر ہوتی ہے۔ انسان کی اخلاقی نشوونما مملکت کے اندر ہی ممکن ہے اور مملکت کے وجود کو صرف "اچھی زندگی" بسر کرنے کی خواہش ہی قائم و دائم رکھتی ہے۔ مملکت انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قائم ہوتی ہے اور انسان اس میں اخلاقی معیار کے مطابق سماجی زندگی اپنے ارادے اور اعتبار سے بسر کرتے ہیں۔ مملکت کی تشکیل و تکمیل کے لیے وابستگی، سیاسی تنظیم اور انصاف کا ہونا لازمی ہے۔"

ارسطو کے خیال میں "بادشاہت کا آغاز ان چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ہوا جہاں لائق اور قابل لوگوں کی کمی تھی۔ ان لوگوں میں وہ شخص جو ذہنی صلاحیت رکھتا تھا ان کا محسن تھا ان کا بادشاہ بن جاتا تھا۔ جب ان بستیوں میں یکساں قابلیت اور صلاحیت کے لوگوں کی بہتات ہوئی تو انہوں نے ایک دستور کے تحت دستوری حکومت قائم کی۔ اس دستوری حکومت میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے والوں نے جب خود کو دولت مند بنالیا تو چند سری حکومت قائم ہوئی جس میں مفاد عامہ کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور بالآخر یہ حکومت پہلے مطلق العنان بادشاہت اور پھر جمہوریت میں تبدیل ہو گئی۔" اس طرح وہ مملکت کو اعزازات اور عہدوں کی بنیادوں پر تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "بعض مملکتیں تشکیلی بنیادوں پر اخلاقی مقاصد کی حامل ہوتی ہیں اور بعض مملکتوں کے مقاصد اخلاقی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔" وہ اصولی ا۔ معیاری بنیادوں کے تحت مملکتوں کی دو قسمیں بیان کرتا ہے۔

1- معیاری مملکت (Normal State) اس مملکت کے مقاصد اخلاقی ہوتے ہیں اور یہی بہترین مملکت ہوتی ہے۔

2- غیر معیاری مملکت (Perverte State) اس مملکت میں مقاصد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور یہ بگڑی ہوئی مملکت ہوتی ہے۔

ارسطو کے خیال میں جن مملکتوں میں حکمران طبقہ بے لوث خدمت کا جذبہ رکھتا ہے اور عوامی فلاح و بہبود اور ایک نیک معاشرتی زندگی کا خواہاں ہو بہترین مملکت کہلاتی ہے۔ اس کے خیال میں ایک شخص کی اچھی حکومت بادشاہت۔ ایک شخص کی بری حکومت استبدادیت' چند اشخاص کی اچھی حکومت اشرافیہ' چند اشخاص کی بُری حکومت چند سری' بہت سے افراد کی اچھی حکومت آئینی حکومت اور بہت سے افراد کی بُری حکومت جمہوریت کہلاتی ہے۔ اس کے خیال میں چند سری حکومت دولت مندوں کی حکومت ہوتی ہے اور یہ لوگ نیک اور ارادے کے اعتبار سے خودغرض ہوتے ہیں۔ جمہوریت غریبوں کی حکومت ہوتی ہے اور غریبوں کی اکثریت کے باعث مملکتی مقاصد کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے خیال میں اشرافیہ طرز حکومت میں القابات' اعزازات' عہدے اور مراعات اخلاقی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے دیئے جاتے ہیں۔ چند سری حکومتوں میں یہ اعزازات دولت کی بنیاد پر اور جمہوریت میں یہ اعزازات پیدائش کی بنیاد پر دیئے جاتے ہیں۔

ارسطو اپنے سیاسی فلسفہ میں بادشاہت جس میں مملکت کا بہترین شخص حکمران ہوتا ہے' اشرافیہ جس میں بہترین افراد کے طبقے کی حکومت ہوتی ہے اور دستوری جمہوریت جس میں متوسط طبقے کا اقتدار زیادہ ہوتا ہے صحیح مانتا ہے جبکہ جابرانہ بادشاہت' چند امیروں کی چند سری حکومت اور جمہوریت مطلق کو حکومت کی بگڑی ہوئی شکلیں قرار دیتا ہے۔ ارسطو نے جمہوریت اور اشرافیہ کی خوبیوں سے مزین بہترین نظام حکومت دستوری جمہوریت کے نام سے پیش کیا جس میں اس نے عوام کے فیصلے کو ماہرین کے فیصلے سے بہتر قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں بہترین سیاسی

جماعت متوسط لوگوں سے جنم لیتی ہے اور وہی حکومت پائیدار اور مستحکم ہوتی ہے جس میں متوسط طبقہ کے افراد زیادہ ہوں لیکن ایسی حکومتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ جمہوریت میں وہ لوگ جو ایک لحاظ سے برابر ہوتے ہیں ہر لحاظ سے برابر نہیں ہوتے۔ اس کے نزدیک دستوری حکومت کسی خاص قاعدے کی پابند نہیں ہوتی اور سیاسی اصولوں کے مقابلے میں زیادہ مفید ہوتی ہے۔

ارسطو کے خیال میں قانون کی حکومت شخصی حکومت کے مقابلے میں بہتر ہے کیونکہ قانون پر خواہش کا اثر غالب نہیں آتا اور اس کی عملداری میں خدا اور عقل کو حاکم تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ مطلق العنان حکومت میں حیوانیت اور انسان کی نفسانی خواہشات پروان چڑھتی ہیں۔ اس کے خیال میں قانون دستور کے تابع ہوتا ہے اور قانون کے ذریعے حکمرانوں کو ایسے طریقے بتانا مقصود ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے حکم منوا سکیں اور قانون کے ذریعے ہی دستور کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک ہر وہ شخص جو مملکت کے قانونی اور انتظامی معاملات میں شریک ہونے کا حق رکھتا ہے اس مملکت کا شہری ہوتا ہے۔ قانونی، انتظامی معاملات اور دیگر شعبہ جات بشمول عدلیہ کے فرائض کی بجا آوری وہ خصوصی معیار ہے جس کی بنیاد پر ہی فرد شہری کہلوا سکتا ہے اس کے علاوہ پیدائش، ماں باپ سے تعلق اور جائے پیدائش بھی شہریت کے لیے لازمی ہیں۔

ارسطو کے نزدیک مملکت کی بنیاد عدل ہے اور عدل کے وہ اصول جو مفاد عامہ کی بجائے حاکموں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائے جائیں ناقص اور مسخ شدہ ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک عدل ایک قسم کی مساوات ہے جس سے مملکت میں توازن برقرار رہتا ہے۔ اس کے نزدیک مملکت کا دستور عدل کے مخصوص تصور کا مظہر ہے اور ایک ایسا شفاف آئینہ ہوتا ہے جس میں شہریوں کی نیت، سیرت، اخلاقی معیار اور عدل کا عکس نظر آتا ہے اور جب تک شہریوں کے

خیالات اور ارادوں میں تبدیلی واقع نہ ہو دستور میں تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ اس کے خیال میں دستور میں خامیاں مثالی مملکت کی بگڑی ہوئی شکل ہیں۔ وہ افلاطون کی مثالی ریاست کو مدنظر رکھتا ہے لیکن ایسی مملکت بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ فلسفیوں کو خیالی دنیا کی بجائے عملی دنیا میں حالات و واقعات کے مطابق کام کرنے کی تائید کرتا ہے۔ اس کی نظر میں پائیدار اور مستحکم دستور وہی ہے جس میں شہریوں کے سیاسی اختیارات کی تقسیم اور ہر طبقے کے احساسات اور مفادات کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

ارسطو کے نزدیک مکمل انقلاب وہ کہلاتا ہے جو کسی بھی معاشرے کے عمومی' سماجی اور سیاسی نظام کے بنیادی ڈھانچے کے علاوہ اس کے سیاسی اصولوں میں بھی تبدیلی لائے جبکہ نامکمل انقلاب صرف ایک ہی شعبہ کو تبدیل کرتا ہے۔ خونی انقلاب مکمل بھی ہو سکتا ہے اور نامکمل بھی لیکن دونوں حالتوں میں خون خرابہ ہوتا ہے اور بہت سی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس کے نزدیک الیکشن یا اسمبلی کے اندر انقلابی تبدیلی آئینی انقلاب' مقتدر اعلیٰ کی تبدیلی شخصی انقلاب' سیاسی اصولوں اور ضابطوں کے علاوہ معاشرتی ڈھانچے کی ساخت میں تبدیلی غیر شخصی انقلاب' برسراقتدار طبقات کی تبدیلی طبقاتی انقلاب اور ایسے انقلاب جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا بے مقصد انقلاب کہلاتے ہیں۔ اس کے خیال میں عدم مساوات کا احساس' معاشی ناہمواری' سیاسی جانبداری۔ متوسط طبقے کا نہ ہونا اور انتہا پسند نظریات معاشرے کو غیر مستحکم اور انقلاب کی راہ ہموار کرتی ہے۔ وہ انقلاب کا راستہ مسدود کرنے کے لیے عدم مساوات' سیاسی بدعنوانیوں کا خاتمہ۔ معاشی مساوات کا قیام' نظام تعلیم اور معاشرتی نظام میں مطابقت اور متوسط طبقے کی موجودگی ضروری قرار دیتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک ایسی مساوات جس کا مطلب مساوی حقوق کی تقسیم ہے کی خواہش بغاوت کا سبب بنتی ہے۔ جو کم ہوتے ہیں بغاوت کرکے دوسروں کے برابر آنے کی کوشش کرتے ہیں' جو برابر ہوتے ہیں وہ بغاوت کے ذریعے دوسروں سے

آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ دیئے گئے حقوق پر اکتفا نہیں کرتے اور زیادہ حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ بغاوت کے دوسرے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے وہ حکمران طبقہ کے لالچ، شہریوں سے ناروا سلوک اور ناانصافی، سیاست دانوں کے مالی مفادات اور بیوروکریسی کے راج کو مملکت کے زوال کی بڑی وجوہات قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک دستور میں بنیادی خامی یا نقص انقلاب برپا کرتا ہے۔ ارسطو نے ایسے انقلاب کی روک تھام کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں دستور کی مکمل پاسداری، شہریوں اور محکوموں میں اطاعت کا جذبہ، گروہ یا طبقے کے اقتدار میں اعتدال، حاکموں کو سیاسی اقتدار سے مالی مفاد حاصل کرنے کی ممانعت، حکومتی آمد و خرچ کی تشہیر، نااہلوں کی سرکاری عہدوں پر تعیناتی پر پابندی اور سرکاری عہدیداروں کو دیر تک ایک ہی عہدہ پر فائز نہ رکھنا شامل ہیں۔

ارسطو مملکت کی جانب سے نافذ قومی فطرت سے یکساں ایسے تعلیمی نظام کو جو فطرت، عادت اور عقل پر مبنی ہو درست قرار دیتا ہے۔ اس نے ایتھنز میں رائج تعلیمی نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلا حصہ سات برس کی عمر سے ابتدائی جوانی تک اور دوسرا حصہ اکیس برس تک۔ وہ اسپارٹا کے تعلیمی نظام کو جو مملکت کے ہاتھوں میں تھا اور غریبوں اور امیروں کے لیے یکساں تھا کو پسند کرنے کے باوجود صرف جسمانی ورزش کے ذریعے نشوونما کے طریقہ کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ نہ تو ریاضی، فلسفہ اور کلام کی تعلیم کو سیاسی اہمیت دیتا اور نہ ہی زندگی، موت اور خیر و شر کے مسئلوں میں الجھتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد سیرت کو اجاگر کرنا ہے۔ وہ موسیقی کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہوئے فرصت اور فراغت کے لحات کو لطف اور انبساط میں گزارنے کو قابل قدر سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں اتحاد کا مطلب شہریوں میں مزاج۔ نسل اور مذہب کے اختلاف کا جذبہ ہے جس کے بغیر یکسانیت پیدا ہوتی ہے اور ترقی کی راہیں رک جاتی ہیں۔

ارسطو کے نزدیک انسانی زندگی کا بنیادی مقصد حصول مسرت ہے۔ یہ مسرت

فرد اور مملکت کے حدود کے تعین سے حاصل ہوتی ہے جس کے لیے تعلیم کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ تعلیم کے ذریعے جہاں مملکتی مقاصد کی تکمیل ممکن ہے وہاں انسان کی جسمانی اور ذہنی نشوونما ہوتی ہے۔ ارسطو کے خیال میں انسان جسم اور روح کا مجسمہ ہے اور عقل انفعالی کا تعلق براہ راست انسانی جسم سے ہوتا ہے۔ بچوں کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ اخلاقی نشوونما ضروری ہے اور اخلاقی نشوونما کے لیے موسیقی کی تعلیم لازمی ہے جو انسانی دماغ پر گہرے اثرات مرتب کرنے کے علاوہ اخلاق سازی اور تعمیر سیرت و کردار میں بہترین محرک ثابت ہوتی ہے۔ عقل فعالی کے لیے سائنس اور خالص فلسفے کی تعلیم ضروری ہوتی ہے اور بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں مابعد الطبیعات، علم ہندسہ، طبعی تاریخ، طبیعات، ریاضی، حیاتیات، علم نجوم، منطق اور جمالیات کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ اس کے خیال میں تعلیم کے ذریعے نشوونما، مملکتی مقاصد کی تکمیل اور حقیقت تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے خیال میں حکومت کے لیے لازمی ہے کہ وہ نصاب وضع کرتے وقت مقاصد، اغراض، ذہنی رجحانات، طرز زندگی، ضروریات اور معاشرہ جبکہ بچے کو تعلیم دینے کے لیے اس کی مختلف ذہنی حالتوں اور کیفیتوں کو مدنظر رکھے۔ وہ بچے کی تعلیم کے لیے عمر کی سطحیں مقرر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "پانچ سے سات سال تک ابتدائی تعلیم، سات سے چودہ سال تک پرائمری تعلیم، چودہ سے اکیس سال تک ثانوی تعلیم اور اکیس سال کے بعد اعلیٰ تعلیم دی جانی چاہیے۔ ابتدائی تعلیم میں کھیل، ورزش ہونی چاہیے، پرائمری تعلیم میں بچے کی نفسیات اور میلانات کے مطابق صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے اور اس کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ریاضی اور موسیقی کے ذریعے ذہنی نشوونما کی جائے۔ ثانوی تعلیم میں بچے کو ایسی تعلیم دی جانی چاہیے جس سے اس کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی نشوونما میں توازن پیدا ہو۔ اس عرصہ کے دوران اسے ریاضی، علم ہندسہ، علم نجوم، قانون، اخلاقیات، ادب، فن تقریر، فلسفہ اور سیاسیات کی تعلیم ضرور دی جائے۔ اعلیٰ تعلیم میں اسے اس کی

ذہانت کے مطابق مملکت کی اہم ذمہ داریوں کے قابل بنایا جائے اور اسے علم طبیعات، حیاتیات، نفسیات، فلسفہ، الہیات، منطق اور مابعدالطبیعیات کی تعلیم دی جائے۔ اس کے خیال میں مملکت کو تعلیم پر مکمل کنٹرول رکھنا چاہیے تعلیم کی بنیاد تحقیق پر ہونی چاہیے۔ اس کے خیال میں نفسیات تعلیم کی بنیاد ہے اور تعلیم مملکتی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ تعلیم کا حق صرف آزاد شہریوں کو حاصل ہو عورتوں کی تعلیم مردوں کے برابر نہیں ہونی چاہیے۔"

وہ افلاطون کے اشتمالی نظریے کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "محافظوں اور سپاہیوں کی بیویاں نہ ہونے سے جہاں عفت و عصمت کی کوئی قدر نہ ہوگی وہاں بدکاری اور بداخلاقی عام ہوگی اور محبت و الفت پیدا نہیں ہوسکے گی۔ سماج میں اخلاقی بے راہ روی سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہوگا۔ اولاد اپنے باپ کی فطری محبت سے محروم ہوگی اور اس کی نشوونما میں کمی واقع ہوگی ان کی سیرت اور شخصیت نامکمل رہے گی جس سے سماج کو ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔"

ارسطو ذاتی ملکیت کو بالکل ختم کرنے کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "ذاتی ملکیت کے بغیر انسان کی فطری خواہشات ادھوری اور اس کی شخصیت کی تکمیل نامکمل رہتی ہے۔ ذاتی ملکیت سے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر ہونے کے امکان کو مملکت کی جانب سے دولت کی حد بندی قائم کرکے روکا جاسکتا ہے۔"

ارسطو کے زمانے میں مختلف ممالک میں غلاموں کی اکثریت تھی اور انہیں شہریت کا حق حاصل نہیں تھا۔ ہومر نے اخلاقی بنیادوں پر غلام رکھنے کی مذمت کی۔ سولن نے غلام بنانے کے تمام طریقوں کو ظالمانہ قرار دیا لیکن اسے ختم کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ افلاطون نے غلامی کے نظام کو برقرار رکھا اور ارسطو بھی غلامی کو مستقل سماجی عنصر قرار دیتے ہوئے سماج کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ غلامی کو اخلاقی بنیاد پر جائز اور غلامی کے نظام کو فطری قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ذہنی اعتبار سے سب انسان برابر نہیں ہوتے اور جو ذہنی اعتبار سے فائق اور بہتر ہو

وہ اپنے سے کم صلاحیتوں والے افراد پر حکومت کرسکتا ہے جبکہ جسمانی مشقت اور محنت کے لیے وہی موزوں ہیں جو جسمانی اعتبار سے قوی ہوں گے۔ اس کی نظر میں قدرت خود ہی بعض انسانوں کو غلام اور بعض کو آزاد شہری پیدا کرتی ہے اور غلام اپنے آقاؤں کی خوبیوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس نے غلاموں کے لیے حقوق متعین کرتے ہوئے کہا کہ "شہریوں کو چاہیے کہ وہ غلاموں سے اچھا برتاؤ کریں اور ان پر ظلم نہ کریں وہ صرف ان جنگی قیدیوں کو غلام بنائیں جو ذہنی اعتبار سے پست ہوں۔" اس کے نزدیک یونانی مہذب اور ذہین ترین قوم ہونے کے ناطے ورثی یا فطری اعتبار سے غلام نہیں بن سکتا بلکہ اس کا غلام بن جانا محض اتفاقی یا حادثاتی ہوسکتا ہے۔ وہ غلاموں کے لڑکوں کو اور شکست خوردہ فوجیوں کو غلام بنانا پسند نہیں کرتا اور جنگوں کو اخلاقی لحاظ سے ناجائز قرار دیتا ہے لیکن وہ اپنے اس نظریہ میں فطری غلامی اور آزادی کا صحیح معیار پیش نہیں کرسکا۔

ارسطو نے اپنے تصور انقلاب میں مکمل طور پر استقراری طریقہ مطالعہ استعمال کیا اور اس طریقہ مطالعہ کے ذریعے معروضی نتائج اخذ کیے جس کے باعث اسے میکاویلی کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا تصور انقلاب نہ صرف مختلف منطقی تضادات سے پاک ہے بلکہ ہر دور میں انقلابیوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ اور اس کے تصور انقلاب پر آج تک کسی نے تنقید نہیں کی ہے۔

ارسطو اپنے دور کا اس لحاظ سے بھی منفرد فلسفی ہے کہ اس نے عہد یونان میں پہلی دفعہ تعلیمی اور سیاسی نظریات کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرکے سماجی علوم کی ترویج میں کئی نئے اضافے کیے۔ اس نے عملی خیالات کو ترجیح دی اور سیاسیات اور تعلیم کو یکجا کرتے ہوئے کہا کہ "تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعے افراد اور مملکت کے حقوق و فرائض اور اختیارات کے دائرہ کار کا تعین ممکن ہے۔" اس نے تحقیق اور علم کی بنیاد اپنے ذاتی مشاہدہ پر رکھی بلکہ انفرادی

اختلافات اور انسانی نفسیات کو مد نظر رکھ کر لوگوں کے طبعی میلانات کے مطابق تعلیم دینے کے رواج کی بنیاد ڈالی۔ اس کے نزدیک تعلیم نجی ہاتھوں کی بجائے مملکت کے پاس ہونی چاہیے۔

ارسطو سے قبل یونانی افکار میں اخلاقیات کا علم تمام علوم پر محیط تھا لیکن ارسطو پہلا مفکر ہے جس نے اخلاقیات کی اہمیت کو اپنی جگہ برقرار رکھتے ہوئے دیگر علوم کو الگ اور جداگانہ حیثیت دی۔ اس نے ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنا پر نئے اور کارآمد تصورات پیش کیے جنہیں آج بھی معاشرتی اور سائنسی علوم کی بنیاد سمجھتے ہوئے مغربی دنیا مکمل طور پر استفادہ کر رہی ہے۔

ارسطو وہ پہلا سائنس دان ہے جس نے علم حیاتیات کی بنیاد رکھی۔ تاریخ میں اس نے طبی سائنس خصوصاً حیاتیات پر بہت کچھ لکھا۔ اس نے ہزاروں پودوں اور جانوروں کی گروہ بندی کی اور ان کی جنس اور دیگر نوع کا تعین کیا۔ ان کی پیدائش اور عمر کے علاوہ ان کی نشوونما کے ذرائع تلاش کیے۔ بے شمار جانوروں پر سرجری کے تجربات کر کے حیرت انگیز نتائج اخذ کیے۔ اس نے رحم پر جنس کی حیرت انگیز طور پر نشاندہی کی۔

ارسطو بابائے نفسیات بھی ہے اس نے انسانی دماغ اور جسم کی نشوونما پر توجہ دی۔ ارسطو پہلا فلسفی ہے جس نے انسانی دماغ کی دو صورتیں بتائیں اول کسی چیز کو دیکھنا دوم اس پر سوچنا۔ اس بنا پر اس نے والدین کو تلقین کی کہ وہ بچے کے سامنے ایسے اعمال و افعال پر عمل پیرا ہوں جو اخلاقی نقطہ نظر سے درست ہوں۔ ارسطو کے اس اصول کو آج بھی اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ اس کے زمانے میں تھی۔

ارسطو کے نزدیک علم سائنس نظریاتی' سیاسی اور علمی سائنسوں پر مشتمل ہے نظریاتی سائنس جس میں ریاضی' طبیعیات اور مابعد الطبیعیات شامل ہیں ایسی چیز پر بحث کرتی ہے جن میں ترمیم کرنا انسانی بس سے باہر ہے۔ یہ انسان کو ابدی اور مستقل حقائق کے قریب تر لاتی ہے اور یہی سچ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ سیاسی

سائنس کا تعلق شاعری، علم ادویات اور علم زبان سے ہے جبکہ کی عملی سائنس تغیر پذیر چیزوں سے متعلق ہے۔

کالٹن کے مطابق کنفیوشس کے بعد ارسطو ہی عقل سلیم اور اعتدال کا سچا پیروکار ہے۔ اس نے علم سیاسیات کے طریقہ کار میں نہ صرف ایک نئے رجحان کا اضافہ کیا، بلکہ اعتدال و توازن بھی پیدا کیا۔ مارکس کے مطابق ارسطو مثالی ریاست کے تصور کو چھوڑ کر عملی سیاست کی طرف راغب ہوا جس کی بنیاد تجریدی طریقہ پر ہے۔ ارسطو نے نیا فلسفہ تخلیق کرنے کی بجائے مروجہ علم کو مرتب کیا اور تاریخ کو اپنے مطالعہ کے بنیادی اصولوں کا ایک حصہ قرار دیا۔ بارکر کے مطابق ارسطو کی استقراری عادت فطری طور پر تاریخی رجحان، روایت کا احترام اور رائے عامہ کے فیصلے کو بے جھجک تسلیم کرنے سے منسلک ہے۔

ارسطو کا انداز تحریر استقراری، تجرباتی اور جدلیاتی ہے وہ خیالات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے منطق سے رسائی حاصل کرتا ہے۔ اس کے مباحث، تاریخیت اور مشاہدات پر مبنی اور انتہائی واضح ہیں اس نے سیاسیات کو اخلاقیات سے الگ کرکے ایک خودمختار سائنس کا درجہ دیا۔ اس کی تحریروں میں اگرچہ افلاطون جیسی ادبی چاشنی موجود نہیں ہے لیکن سائنسی حقائق اس قدر ہیں کہ ان کی تحریر زیادہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس کے خیال میں حواس خمسہ سے محسوس ہونے والا جہاں ہی اصل حقائق کا جہاں ہے۔

آیئے ارسطو کی ان تالیفات و تصنیفات کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں، جو اس وقت بھی سائنس، فلسفہ اور منطق میں مشعل راہ ہیں۔

# ارسطو کی تالیفات و تصنیفات

ارسطو صحیح معنوں میں ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا۔ وہ فقط عالم ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے مشاہدات کرنے والا اور نہایت وسیع پیمانے پر فطرت کا علم رکھنے والا تھا۔ اس نے ماقبل فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا اور ہر قسم کی تحقیقات کیں۔ اسی لیے اس کی ساری تصانیف ذہن انسانی کے لئے آج بھی بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ارسطو کا کمال یہ ہے کہ اس نے سائنس، فلسفہ و منطق کی ایسی اصطلاحات وضع کیں جو نہ صرف موجودہ دور میں بھی معتبر سمجھی جاتی ہیں بلکہ آج بھی فلسفی اور سائنس دان انہی اصطلاحات کی مدد سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نے اپنی تصنیفات میں اخلاقی مسائل، اخلاقیات، سماجی و سیاسی سوالات اور فن و خطابت کی مہارت پر روشنی ڈالی۔ اس کی تصنیفات صدیوں سے مغرب و مشرق میں فلسفیانہ فکر کے ارتقا کا تعین کر رہی ہیں۔ ارسطو نے اپنی تصنیفات میں تفکر کی صورتوں کے علم کا مفصل نظام مرتب کیا اور فطرت سے متعلق اس کی تحریریں سائنس کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ارسطو نے اپنی تصانیف میں یونان کے سیاسی و معاشرتی نظام کی تشکیل نو کے لیے نئے نئے نظریات قائم کیے اور ان نظریات کی بنیاد فطری اصولوں پر رکھی۔ اس کا دبستان فلسفہ آج بھی موثر ترین نظام مانا جاتا ہے۔

سکندر کی موت کے بعد ارسطو کو اچانک ایتھنز چھوڑنا پڑا جس کے باعث اس کی بہت ساری تصنیفات اس کی اکیڈیمی میں رہ گئیں اور جو ادھورے مسودات وہ ساتھ لے گیا تھا موت نے انہیں بھی مکمل کرنے کی اسے مہلت نہ دی۔ اندرونیکوس (60-50 ق م) اور ہرمپوس اسکندروی (200 ق م) کے حوالہ سے کچھ پرانے مورخین کا خیال ہے کہ ارسطو نے چار سو کے قریب کتابیں تحریر کی تھیں اور جو اس وقت کتابیں موجود ہیں وہ ان کا ایک جزو ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ درحقیقت یہ چار سو ابواب تھے جنہیں کتابیں خیال کیا گیا ہے۔ بطلیموس جو غالباً پہلی یا دوسری صدی کا مشائی تھا کے مطابق ارسطو کی تصانیف کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ارسطو نے سب سے پہلے منطق (Logic) پھر بالترتیب مادی سائنس یعنی طبیعیات، اخلاقیات اور سیاسیات پر اظہار خیال کیا اور سب سے آخر میں مابعد الطبیعیات پر لکھا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اس کی مابعد الطبیعیات پر لکھی گئی کتاب Meta Physics ادھوری شکل میں موجود ہے۔

ارسطو کی منطق پر لکھی گئی کتابیں بازنطینی عہد میں یکجا کی گئیں اور اس مجموعے کا نام Organon رکھا گیا۔ اس مجموعہ کے حصوں میں مقولات (Categories)، تعبیر (On Inter Pretation)، اولی اور آخری تجلیات (Prior And Posterior Anlytic) اور موضوعات (Topics) آج بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جو مدرسی فلسفہ، سائنسی اصلاحات کے متعین کرنے، استدلالی طریقے دریافت کرنے اور ذہنی پختگی حاصل کرنے کی بنیاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ ارسطو نے طبعیات پر آٹھ، موسمیات پر چار، علم ہیئت پر چار، ابتدا و انتہا پر دو، حیوانوں کے اعضا پر چار، جانوروں کے ارتقا اور انکی ابتدا پر پانچ پانچ، روح پر چند، نکومیشن اخلاقیات (Nichomavchean Ethics) پر دس، سیاسیات پر آٹھ، فصاحت و بلاغت (Rhetorics) پر تین اور فن شاعری پر تین کتابیں تحریر کیں۔ ان کے علاوہ اس کا بہت زیادہ تحقیقی اور تخلیقی کام تباہی زمانہ

کے نذر ہوا لیکن ارسطو کو جن دو تصانیف نے بام عروج تک پہنچایا وہ اخلاقیات (Ethics) اور سیاسیات (Politics) ہیں۔

سٹرابو اور پوٹارک نے تھیوفراسٹس جو ارسطو کے بعد اکیڈیمی کا سربراہ بنا اور پچاسی سال کی عمر میں 286 ق م میں فوت ہوا کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تھیوفراسٹس کے وفات پر اس کی اور ارسطو کی تصانیف سیلیوس کے مقام پر ایک تہہ خانہ میں چھپا دی گئی تھیں۔ بعد ازاں سلا کے زمانے میں اپلیکون نے ان کو دریافت کیا اور روما لے گیا جہاں ٹارانیو اور اندرونیکوس نے انہیں دوبارہ شائع کیا اور ارسطو کی تمام کتابیں اندرونیکوس کے دور تک زیر استعمال رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کی کتب کو مجموعہ کی شکل دینے اور دوبارہ اشاعت کے وقت کچھ اضافہ کیا گیا ہے جیسا کہ طبیعیات کے آٹھ حصوں میں سے ساتواں حصہ اگرچہ ارسطو کے خاکے سے تیار کردہ ہے لیکن یہ بعد میں اضافہ شدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح حیاتیات پر جامع رسالے "حیوانات کا حال" دس کتابوں میں ہے جن میں ایک بھی اصلی معلوم نہیں ہوتی۔ نباتات پر لکھی گئی کتاب بھی اصلی نہیں ہے۔ مابعد الطبیعیات کا مجموعہ ارسطو کی وفات کے بعد مدون ہوا اور اس میں وہ تمام تحریریں یکجا کر دی گئیں جن کو ارسطو نے "فلسفہ اولین" کا نام دے رکھا تھا۔ اندرونیکوس کے مجموعے میں یہ حصہ طبیعیات کے بعد رکھا گیا اور اسی باعث اس کا نام مابعد الطبیعیات رکھا گیا۔ اس میں بھی دوسرا اور گیارہواں حصہ اضافہ شدہ معلوم ہوتا ہے۔ اخلاقیات پر اس کی تصنیف Nicomachean Ethics دس حصوں اور سیاسیات (Politics) آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ اخلاقیات پر یوڈیموس کی نظرثانی ہے۔ اس میں سے صرف پہلا، تیسرا اور چھٹا حصہ محفوظ ہے۔ حسنات اور سئیات پر لکھا گیا چھوٹا رسالہ بعد کے زمانہ انتخابیت کا ہے۔ علم الاقتصاد کا پہلا حصہ جس کو فلوڈیموس اور تھیوفراسٹس کی جانب منسوب کیا گیا ہے یقیناً ارسطو کا نہیں ہے اور دوسرا حصہ بہت بعد کا ہے۔ خطابت پر لکھی گئی تین کتابوں میں سے تیسری کتاب ارسطو کی معلوم

نہیں ہوتی۔ Poetics شاعری پر ہے جو موجودہ شکل میں ارسطو کی تصنیف کا ایک جزو ہے۔

ارسطو کے نزدیک خطابت (Rhetoric) کا مقام عملی شاعرانہ علوم کے بین بین ہے۔ وہ خطابت کو ایک فن لطیف کے ساتھ ساتھ منطق، سیاسیات اور اخلاقیات کا جزو بھی سمجھتا ہے۔ ارسطو نے کتاب خطابت میں پہلا اور دوسرا حصہ صرف نظریہ دلیل خطابی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ارسطو نے فنون لطیفہ میں سے فقط شاعری پر الگ کتاب لکھی ہے لیکن اس کتاب میں بھی تصور جمال کی غیر معین صورت پائی جاتی ہے۔ ارسطو کے نزدیک فن لطیف اشیاء کی باطنی فطرت کی نقل ہے اور یہ فن واقعات کو مائیت اشیاء کے مطابق بیان کرتا ہے۔ اس کے خیال میں صور، فن، قوانین کلیہ کے نمونے ہوتے ہیں اس کے نزدیک شاعری بہ نسبت تاریخ کے زیادہ شریف فن ہے جسے وہ فلسفے سے قریب تر سمجھتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک موسیقی سے لذت اندوزی، تربیت اخلاق، تفریح اور تزکیہ جذبات جیسے چار کام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ فن لطیف تاثرات کو ایک معین قانون کے تحت لاتا ہے اور اس وقت انسان اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے جو ہر انسان میں مشترک ہے۔

ارسطو کے نزدیک دینیات ایک تجریدی توحید ہے جس کے نظام کائنات میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ فطرت ایک الٰہی چیز ہے اور حصول مقاصد کی ایک تنظیم ہے۔ روح انسانی الٰہی ہے۔ خدا عالم ربط و نظم اور اس کی حرکت کا مصدر ہے۔ وہ اپنی قوم کے مذہب پر صرف اس حد تک صحیح سمجھتا تھا کہ وہ ایک خدا پر عقیدہ رکھتی ہے اور انجم و افلاک کی الٰہی فطرت کی قائل ہے۔

ارسطو کی تصانیف کا سریانی زبان میں ترجمہ پانچویں صدی عیسوی میں نسطوری عیسائیوں نے کیا۔ اس کی منطق پر لکھی گئی کتابوں کا ترجمہ بوتھیوس (525-570 عیسوی) نے کیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں ان کتابوں کے عربی تراجم

ہوئے۔ 1215ء میں پیرس میں پاپائے روم کے نمائندے نے ارسطو کی تصانیف پر لیکچر دینا منع کر دیا۔ 1231ء میں گری گوری نہم نے ان تصانیف کی تہذیب و تنقیح کے لیے باقاعدہ ایک ٹیم تشکیل دی۔ 1235ء میں ان کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ 1360ء میں ہر عیسائی مدرسے میں ان تصانیف کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور مذہبی جماعتیں ان لوگوں کو سزا کا مستوجب قرار دیتی تھیں جو ارسطو کے خیالات سے اختلاف رکھتے تھے۔

ارسطو کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ اس نے متقدمین کی مدد کے بغیر ایک نئے علم منطق کو مدون کیا جو کہ ہر علم کا اسلوب ہے۔ اس علم سے انسان صحیح فکر کرنے کا فن اور اسلوب سیکھتا ہے اور سنجیدہ مباحث میں ہر اہم اصطلاح کو بڑی سختی سے پرکھا اور جانچا جاتا ہے۔ ارسطو نے علم منطق کے تین قوانین پیش کیے جو آج بھی معروف ہیں۔

1- اصول عینیت --- الف' الف ہے۔

2- اصول غیر تناقض --- کوئی چیز بھی بیک وقت الف اور غیر الف نہیں ہو سکتی۔

3- اصول امتناع اوسط --- ہر شے آیا الف ہے یا غیر الف۔

ارسطو کہتا ہے کہ کلیات اور منفردات دونوں حقیقت میں وجود رکھتے ہیں۔ ایک کلیہ محض ایک خصوصیت ہے جو متعدد مثالوں میں مشترک ہے۔ ان خصوصیات کا تصور ہمیں منفردات سے تجرید کی بنا پر دستیاب ہوتا ہے۔ منفردات کے بغیر کلیات اور کلیات کے بغیر منفردات ممکن نہیں۔ دونوں منطقی طور پر ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ایک کلیہ ہر ایک منفرد میں بالکل عین ہوتا ہے۔ کلیات اشیاء کے عالم خارجی میں ہوتے ہیں لیکن ان کا وجود معروضی طور پر خصوصیات کی طرح موجود ہوتا ہے۔ ایک کلیہ ایک ایسی خصوصیات ہے جو عینیت کے ساتھ تمام منفردات میں موجود ہوتی ہے اور اپنی مثالوں سے الگ اس کا وجود نہیں ہوتا۔

ارسطو نے سقراط اور افلاطون کے قائم کردہ نظریات کو بنیاد بناتے ہوئے علم منطق کی عمارت تعمیر کی اور اس کا نام Analytic رکھا۔ وہ اس علم منطق کو فن تحقیق کی تمہید اور حکمی اسلوبیات (Methodology) قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جز کو کل سے اور معمول کو اس کے علل سے اخذ کرنا دراصل حکمت ہے۔ انسان کی زندگی میں علم کا حصول معکوس سمت سے شروع ہوتا ہے۔ روح اپنی فطرت عاقلہ میں تمام علم کا امکان رکھتی ہے اور یہ علم اسے بتدریج حاصل ہوتا ہے۔ یقینی علم کے حصول کے لیے ہمیں انفرادی مشاہدات سے کلی تجربات کی تجرید کرنی پڑتی ہے اور حافظے کی مدد سے ادراک سے تجربے اور تجربے سے علم کی طرف بڑھتے ہیں۔ حواس ہمیں دھوکا نہیں دیتے بلکہ تمام تر غلطیاں ان کی شہادت کی غلط تاویل سے پیدا ہوتی ہیں۔

ارسطو منطق کے ذریعے قیاس استخراجی کے بعد ثبوت کے ساتھ استقرا سے بحث کرتا ہے۔ ارسطو سب سے پہلا شخص ہے جس نے یہ دریافت کیا کہ سوجلزم ہی وہ اساسی سانچہ ہے جس کے اندر ہر قسم کا فکر ڈھلتا ہے۔ قیاس استخراجی یا سوجلزم کی تعریف کرتے ہوئے ارسطو کہتا ہے کہ "یہ ایک بیان ہے جس میں بعض مقدمات کی بنیاد پر ایک نیا مقدمہ بطور نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور تصدیق دو تصورات پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے ایک موضوع ہوتا ہے اور دوسرا محمول۔ تصدیق کی تقسیم کیفیت کے لحاظ سے مثبت اور منفی جبکہ کمیت کے لحاظ سے کلی جزئی اور غیر معین کی جاسکتی ہے۔ مخالف تناقص اور تضاد پر مشتمل ہوتا ہے۔ صحیح اور غلط کا دارومدار تصورات کی ترکیب اور اجتماع پر ہوتا ہے۔ ثبوت قیاسیات کی ترکیب سے حاصل ہوتا ہے اور تمام قسم کے ثبوت کا مقصد موجہ کو وجہ سے اخذ کرنا ہے۔ ثبوت کے لیے حاصل کردہ مقدمات میں لزوم اور کلیات ضروری ہیں۔ ایک مکمل ثبوت یا مکمل علم کے حصول کے لیے مختلف واسطوں سے نتیجے کو اعلیٰ ترین مقدمات یا مسلمات سے اخذ کیا جانا ضروری ہے کیونکہ اگر مقدمات خود مشتق ہوں یا نتیجے اور

مسلمات کے درمیان لاتناہی واسطوں کا سلسلہ ہو تو ایسے میں ثبوت کا حصول ممکن نہیں رہتا۔

ارسطو کے نزدیک بالواسطہ علم کے لیے بلاواسطہ علم مقدم ہے۔ بلاواسطہ علم کی دو قسمیں ہیں عام ترین اصول جن کی بنا پر استدلال کیا جاتا ہے اور وہ امور واقعہ جن پر ان اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ واقعات براہ راست ادراک سے حاصل ہوتے ہیں اور عقل کو وجدانی طور پر برائے راست عام ترین اصولوں کا علم ہے۔

ارسطو کے نزدیک قانون اجتماع نقیضین فکر کا سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ یقینی اصول ہے اور وہ اس اصول کے منطقی اور مابعدالطبیعیاتی استحکام کے لیے استقراء کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "تصورات کے تعین یا ان کی تعریف کا مدار کچھ ثبوت پر اور کچھ برائے راست علم پر ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ اس کو استقرا سے تقویت حاصل ہو۔ اگر تمام تصورات میں کلیت اور عمومیت موجود ہو تو محدود معنوں میں وہ تصور جس کی تعریف کی جاتی ہے اشیاء کے جوہر کو ظاہر کرتا ہے اور اگر اس قسم کا تصور اس مشترک عنصر کو ظاہر کر دے جو مختلف انواع کی چیزوں میں بالاشتراک پایا جاتا ہے تو وہ تصور جنسی کہلاتا ہے۔ جب انواع میں تقسیم ناممکن ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم آخری نوعی تصور پر پہنچ چکے ہیں۔"

ارسطو تصور کی تعریف میں ایسے صفات کی موجودگی ضروری قرار دیتا ہے جن کی وجہ سے مکمل اور صحیح طور پر نوع کو جنس سے اخذ کیا جاسکے اور عام سے خاص کی جانب ایک تدریجی سلسلہ قائم ہو سکے۔ اس کے خیال میں جو کچھ جنسی تصور میں پایا جاتا ہے وہ تمام نوع میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک جب ایک ہی جنس کے اندر دو چیزیں ایک دوسری سے بعید ترین ہوں تو وہ متضاد کہلاتی ہیں اور جب ایک تصور دوسرے تصور کی مطلق نفی ہو تو انہیں متناقض کہا جاتا ہے۔ ہر قسم کے تصورات اور ہر قسم کے اشیاء کی نسبت

جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ دس باتوں میں سے ایک نہ ایک کے تحت ضرور آتا ہے وہ ان دس باتوں کو مقولات عشرہ کا نام دیتا ہے۔ وہ دس باتیں' جوہر' کمیت' کیفیت' اضافت' این متی' مقام' قبضہ' فعلیت اور انفعال ہیں۔ ارسطو کے نزدیک یہ تنظیم کامل ہے اور پہلے چار مقولات اہم ترین ہیں۔ جوہر سب سے زیادہ اساسی ہے اور اس کی نسبت سے باقی تمام مشتق اور ثانوی ہیں۔ مابعد الطبیعیات کا خاص موضوع یہی مقولات ہیں۔

ارسطو کے نزدیک حرکت ہر ایک قسم کا تغیر اور ہر امکان کا تحقق ہے۔ حرکت کی چار قسمیں ہیں۔

1۔ حرکت جوہری یا کون و فساد
2۔ حرکت کمیتی یا اضافہ اور کمی
3۔ حرکت کیفیتی تبدیلی یا ایک مادے کا دوسرے مادے میں تبدل
4۔ حرکت مکانی

تغیر کی دیگر تمام قسمیں حرکت مکانی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اعداد میں لامحدود اضافہ اور اجسام کی لامتناہی تقسیم پذیری محض بالقوائے اور امکانی ہے۔ فی الحقیقت اس کا وجود نہیں ہو سکتا۔ جسم محیط کے باہر کی حد ہے اور وقت ماقبل اور مابعد کی جانب حرکت کا شمار ہے۔ عالم کے باہر نہ زماں ہے اور نہ مکان' خلا ناقابل فہم ہے اور وقت کے لیے بھی شمار کنندہ نفس کا ہونا مقدم ہے۔ حرکت فی المکان اور خصوصاً حرکت دوری ایسی یکساں اور مسلسل حرکت ہے جس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ انجام۔ مادے میں کیفی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مادے میں کیفی تغیر بھی ہو سکتا ہے اور عناصر ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اس تغیر میں ایک عنصر کے صفات دوسرے عنصر کے اثر سے بدل جاتے ہیں۔ فعلیت اور انفعال کا یہ تعلق اسی حالت میں ممکن ہو سکتا ہے جب دو ایسے اجسام ہم مقام ہوں جن کے درمیان کچھ مماثلت پائی جائے اور کچھ مخالفت۔ مختلف عناصر میں خالی ملاپ ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کے

ملنے سے نئی قسم کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ فطرت کا عمل ہر جگہ فقط طبیعی ہی نہیں بلکہ فی الحقیقت ساعی الی المقصد یعنی غائی ہے۔ فطرت کوئی کام بغیر مقصد کے نہیں کرتی وہ ہمیشہ بہترین نتیجہ پیدا کرنا چاہتی ہے وہ ہمیشہ جمیل ترین صورت جو ممکن ہو سکتی ہے بناتی ہے۔ فطرت کے اندر کوئی چیز بے صرف یا ناقص نہیں اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ کاموں میں بھی کچھ نہ کچھ الٰہی راز ہوتا ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ سب چیزوں میں ایک حیرت انگیز نظام پایا جاتا ہے۔ تمام کائنات میں حصول مقصد کے لیے ایک سعی اور میلان پایا جاتا ہے اور اس قدر انتظام اور باقاعدگی محض اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

ارسطو کے نزدیک صورت و مادہ کی قدامت اور حرکت کے بے آغاز و انجام ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ عالم قدیم ہے۔ یہ مفروضہ کہ عالم کسی ایک وقت میں آغاز ہوا تھا لیکن ہمیشہ تک قائم رہے گا صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ کون و فساد دونوں باہم وابستہ ہیں اور ناقابل فنا فقط وہی موجود ہو سکتا ہے جس کی نہ تکوین ہوئی ہو اور نہ اس میں فساد ممکن ہو۔ ارضی عالم میں بھی فقط انفرادی اشیاء پیدا اور فنا ہوتی ہیں لیکن اجناس و انواع کا کسی ایک خاص وقت میں آغاز نہیں ہوا اس لیے انسان بھی دنیا میں ہمیشہ سے ہیں۔

ارسطو کے نزدیک عالم دو حصوں میں منقسم ہے عالم فوق، عالم تحت القمر یا عالم ارضی اور عالم فلکی۔ اس کے نزدیک اس امر کی شہادت موجود ہے کہ ستاروں کا مادہ ہماری ارضی اشیاء کے متغیر اور فنا پذیر مادے سے الگ قسم کا ہے۔ ستارے ایتھر کے بنے ہوئے ہیں وہ ایک ایسا مادہ ہے جس کی کوئی ضد نہیں سوائے نقل مکان کے اس میں اور کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی اور دوری حرکت کے سوا اس میں کوئی اور حرکت نہیں ہو سکتی۔ عالم ارضی کی اشیاء چار عناصر سے بنی ہوئی ہیں جن کے اندر دو طرح کی باہمی مخالفت پائی جاتی ہے۔ ایک فرق ان کے وزنی اور ہلکا ہونے کا ہے جو ان کے فطری مقامات کی طرف مخصوص اور براہ راست حرکت کا نتیجہ ہے دوسری قسم کا تضاد کیفیت کی بنا پر ہے جو ان کے اصلی مقامات کے مختلف

اجتماعات سے پیدا ہوتا ہے مثلاً گرم و سرد اور خشک و تر آگ گرم اور خشک ہے ہوا گرم اور تر، پانی سرد اور تر اور زمین سرد اور خشک۔ اس تخالف کی وجہ سے وہ متواتر ایک دوسرے کی طرف عبور کرتے رہتے ہیں۔ جن کا باہمی فاصلہ بہت زیادہ ہے وہ درمیانی مادے کے توسط سے ایک دوسرے پر عمل کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف عالم کی وحدت لازم آتی ہے، جو محرک اول کی وحدت سے بھی اخذ ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی نتیج ہوتا ہے کہ عالم کی شکل مدور ہے۔ زمین جو عالم کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اس کے وسط میں واقع ہے اور اس کی شکل بھی مدور ہے زمین کے گردا گرد پانی ہوا اور آگ کے ہم مرکز کرے ہیں۔ ان کے اوپر افلاکی کرے ہیں جو زمین کے بعد کی نسبت سے اپنے مادے میں زیادہ زیادہ لطیف ہوتے جاتے ہیں ان کروں میں سب سے اوپر ثوابت کا آسمان ہے جسے خدا روزانہ گردش دیتا ہے اور جو لامکان ہونے کے باوجود اس پر محیط ہے۔ ہر کرّہ نہایت عمدگی سے اپنے محور کے گرد گھومتا ہے۔ ہر باہر والے کرّے کا اندر والے کرّے سے وہی تعلق ہے جو صورت کا مادے سے ہے یا محرک کا متحرک سے ہے اس لیے ہر کرّہ ان تمام کرّوں کو حرکت دیتا ہے جو اس کے اندر داخل ہیں سب سے اوپر کا کرّہ تمام اندرونی کرّوں کو اپنی روزانہ گردش میں اپنے ساتھ گھماتا ہے اس طرح سے ہر سیارے کی روزانہ حرکت میں دیگر تمام محیط کرّوں کی حرکت سے خلل پڑتا اگر خاص طور پر اس کا کوئی بندوبست نہ ہوتا۔ دو باہم اقرب سیاروں کے بروج کے مابین اتنی تعداد میں الٹی سمت میں حرکت کرنے والے بروج پائے جاتے ہیں جتنے کہ ان سیاروں کے باہمی اثر کو زائل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان بروج کی تعداد بائیس ہے اور کالپس کے بروج کا ان پر اضافہ کر کے تمام بروج فلکیہ کی تعداد چھپن ہو جاتی ہے ان تعداد میں ثوابت کے بروج بھی داخل ہیں۔ فلک اول کی طرح ہر برج کو حرکت دینے والی ایسی ہی قوت ہو سکتی ہے جو سرمدی، غیر محدود اور غیر مادی ہو اس لیے جتنے بروج ہیں اتنی ہی ارواح بروج ہیں۔ ستارے ذی حیات اور ذی عقل الٰہی ہستیاں ہیں جو نوع

انسانی سے بہت بالاتر ہیں۔

بروج فلکیہ کی حرکت سے خاص کر ان مقامات میں جو سورج کے نیچے واقع ہیں، رگڑ کی وجہ سے ہوا میں روشنی اور گرمی پیدا ہوتی ہے۔ ان مدار آفتاب کے میلان کی وجہ سے سال کے مختلف موسموں میں مختلف مقامات پر گرمی اور سردی کم و بیش ہوتی ہے۔ کون و فساد اور مادے میں جزو مد اس سے واقع ہوتا ہے اور اس کے باعث سے عناصر ایک دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

ارسطو اپنے طبیعی نظریات میں دیماقریطوس کے نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "فطرت میں خلا ناممکن ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خلا میں تمام انسانوں کے گرنے کی رفتار یکساں ہوتی جو ناممکن ہے اس لیے جس فرضی خلا کے متعلق شور مچا ہوا تھا اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔" ارسطو نے فیثاغورث کے اس نظریے کی بھی تردید کی کہ سورج ہمارے نظام کا مرکز ہے۔ ارسطو کے خیال میں زمین ہی اپنے نظام کا مرکز ہے۔

ارسطو علم حیاتیات میں انکساغورث کے اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ "جب انسان نے ہاتھوں سے چلنے کی بجائے ان سے نازک و دقیق کام کیے تو وہ باعقل ہوگیا۔" ارسطو کے خیال میں پہلے انسان باعقل ہوا پھر اس نے ہاتھوں کا نیا استعمال سیکھا۔ وہ ایمپوذر کلیز کے اس نظریے کو بھی مسترد کرتا ہے کہ "اعضا اور عضویے بقائے اصلح کا ثبوت ہیں۔" حیاتیات میں ارسطو نے معلوم کیا کہ پرندے اور رینگنے والے جانور ساخت کے اعتبار سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔ اس نے علم جنسیات کی بنیاد رکھی اور کہا کہ "جو شخص جانداروں کی شروع سے نشوونما دیکھے گا حقیقت اسی پر واضح ہوگی اور اسی کا اصول نظر بہترین ہوگا۔" اس ضمن میں ارسطو نے یونان کے بہترین طبیب بقراط (460 ق م) کی تقلید کی ہے۔

ارسطو نے اپنی علمی مساعی کا بہت سا حصہ حیوانات اور نباتات کے مطالعہ میں صرف کیا اور وہ بلاشبہ اس علم کا سب سے بڑا نمائندہ اور منظم و تقابلی حیاتیات کا

بانی ہے۔ اگرچہ نباتات پر اس نے کتاب نہیں لکھی لیکن بحیثیت معلم وہ نباتات کا بھی بانی کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

اس کے نزدیک حیات حرکت ذاتی کے استعداد کا نام ہے لیکن ہر قسم کی حرکت کے لیے دو چیزیں مقدم ہیں ایک صورت اور ایک مادہ، یعنی ایک محرک اور ایک متحرک۔ ہر جاندار کا جسم مادہ ہے اور صورت اس کی روح ہے۔ لہٰذا روح بغیر جسم کے نہیں ہو سکتی۔ وہ مادی نہیں اور اپنے آپ کو حرکت بھی نہیں دیتی۔ اس کا تعلق جسم کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ صورت کا تعلق مادے سے ہوتا ہے۔ جسم کی صورت ہونے کے لحاظ سے وہ جسم کی غایت بھی ہے۔ جسم روح کے لیے فقط ایک آلہ ہے اور اس کی فطرت اسی مقصد سے متعین ہوتی ہے۔ آلاتی یا عضوی (Organic) ہونے کے یہی معنی ہیں۔ اس کے نزدیک روح ایک ایسی قوت ہے جو جسم کو حرکت دیتی ہے اور اس کی ساخت کو متعین کرتی ہے۔ اسی لحاظ سے فطرت کی مقصدی فعلیت جانداری ہستیوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے کیونکہ ان کے اندر آغاز ہی سے ہر عضو اور ہر وظیفہ ایک مقصد کے ماتحت ہوتا ہے لیکن چونکہ روح کی فعلیت مادے کی مزاحمت پر فقط بتدریج غالب آسکتی ہے اس لیے روح کی زندگی کے بھی بے شمار مدارج ہیں۔ نباتات کی زندگی تغذیہ اور تناسل پر مشتمل ہے حیوانات میں اس پر حسی ادراک کا اضافہ ہوتا ہے اور کثیر انواع حیوانی میں نقل مکانی کی بھی قابلیت ہوتی ہے۔ انسان میں اور ترقی ہوتی ہے اور وہ فکر کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ روح غذائی یا روح نباتی دوسری روح حسی یا روح حیوانی اور تیسری روح عقلی یا روح انسانی ہے۔ حیوانات کا تدریجی سلسلہ حیات روح کے منازل ارتقا کے مطابق ہے۔ وہ مسلسل تدریجی ترقی سے ناقص سے کامل کی طرف بڑھتا ہے ان دونوں سلسلوں میں جو کثیر مماثلت پائی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی قسم کے قوانین کے ماتحت ہیں۔

ارسطو کے خیال میں حیات کی ادنیٰ ترین منزل نباتات میں پائی جاتی ہے۔

تغذیہ اور تناسل کے وظائف تک محدود ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کا کوئی ایک مرکز نہیں ہوتا اس لیے ان میں احساس نہیں پایا جاتا۔ جانداروں کے جسم میں مادے کی مختلف اقسام کے مساوی حصے پائے جاتے ہیں اور یہ مادہ عنصری مادہ ہوتا ہے۔ روح کا محل نفس گرم (Pneuna) ہے جو زندگی کا ماخذ ہے۔ یہ ایتھر کے ساتھ ملا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی تخم کے اندر باپ سے اولاد میں منتقل ہوتا ہے۔ حیاتِ غریزی کا خاص مقام مرکز عضو میں ہوتا ہے خون والے جانداروں میں یہ مقام دل ہوتا ہے۔ دل کے اندر اس غذا سے جو رگوں کے ذریعہ سے اس کو پہنچتی ہے خون تیار ہوتا ہے خون سے کچھ تو جسم کو غذا پہنچتی ہے اور کچھ اس سے خاص قسم کے ادراکات پیدا ہوتے ہیں۔ جانداروں کی پیدائش کئی طریقوں سے ہوتی ہے۔ جنسی تناسل کے علاوہ بعض جانداروں میں جن میں بعض مچھلیاں اور کیڑے بھی داخل ہیں' خود زائیدگی بھی ہوتی ہے لیکن طرز تناسل اس کے نزدیک زیادہ کامل صورت ہے۔ نر کا تعلق مادہ سے ایسا ہی ہے جیسا کہ صورت کا تعلق مادے سے۔ بچے کی روح نر کی طرف سے آتی ہے اور جسم مادہ کی طرف سے۔ از روئے علم الاعضا اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مادہ کی فطرت مقابلتہ" زیادہ سرد ہے اس لیے وہ تولیدی مادے کے لیے خون کو پوری طرح تیار نہیں کرسکتی۔ ارسطو کے نزدیک تولید کے عام مدارج یہ ہیں کہ پہلے نطفہ کیڑے کی طرح ہوتا ہے اس کے بعد انڈا بنتا ہے اور اس کے بعد عضوی صورت اختیار کرتا ہے لیکن پیدائش' جسمانی ساخت اور رہنے سہنے کے طریقوں میں جانداروں میں حیرت انگیز اختلافات پائے جاتے ہیں۔

جانداروں کی نو قسموں میں سب سے زیادہ فرق خون والے اور بے خون جانداروں میں ہے اور یہ فرق ریڑھ کی ہڈی والے اور بے ریڑھ کی ہڈی والے جانداروں کے امتیاز کے مطابق ہے۔

ارسطو کے نزدیک انسان دیگر حیوانات سے اس امر میں ممتاز ہے کہ وہ نفس

رکھتا ہے جو اس کے اندر روح حیوانی کے ساتھ متحد ہے۔ اس کی جسمانی ساخت اور اس کی روح کے ادنی افعال بھی اس بلند مقصد کے ماتحت ہوتے ہیں جو اس اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کے قامت کی راستی اور اس کی وضع کا تناسب اس مقصد کی شہادت دیتا ہے۔ اس کا خون سب جانداروں سے زیادہ مصفا اور زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ اس کے دماغ کا وزن اور اس کی حرارت غریزی سب سے زیادہ ہے اس کے ہاتھ اور اس کا آلہ نطق نہایت قیمتی آلات ہیں۔ روح کے حسی افعال میں ادراک اس تغیر کا نام ہے جو جسم کے واسطے سے روح کے اندر محسوس ہوتا ہے اور شے مدرکہ کی صورت ادراک کرنے والے نفس کی طرف منتقل ہوتی ہے مختلف حواس سے ہمیں اشیاء کے فقط وہی صفات معلوم ہوتے ہیں جن کے ساتھ ان کا الگ الگ اور مخصوص تعلق ہے۔ حواس ہمیں جو کچھ بتاتے ہیں وہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے لیکن چیزوں کے کلی صفات مثلاً وحدت عدد، حجم، شکل، وقت، سکون اور حرکت وغیرہ کسی ایک مخصوص حاسہ سے مدرک نہیں ہوتے بلکہ ان کا ادراک اس حاسہ مشترک کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے اندر محسوسات متحد ہو جاتے ہیں۔ اس حاسہ مشترک کی بدولت ہم اپنے محسوسات کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور ان کو خود اپنی جانب اور معروضات اشیاء کی طرف منسوب کرسکتے ہیں۔ اس حاسہ مشترک کا آلہ دل ہے۔ اگر کسی آلہ حس کی حرکت مدت ادراک کے بعد تک جاری رہے اور آلہ مرکزی کی طرف منتقل ہو کر شئے مستحضر کا ایک نیا استحضار پیدا کرے تو اس کو تخیل کہتے ہیں۔ حس مشترک کے دیگر بیانات کی طرح تخیل سچا بھی ہوسکتا ہے اور جھوٹا بھی اگر کوئی تخیل کسی پہلے ادراک کی صحیح نقل ہو تو اس کو تذکرہ یا یاد کہتے ہیں جسے خود شعری طرز پر بھی پیدا کرسکتے ہیں۔ لہذا حافظے کا مقام بھی حس مشترک ہی ہے۔ انہضام کی وجہ سے آلہ مرکزی میں جو تغیر ہوتا ہے اس سے نیند پیدا ہوتی ہے اور اس کی حرارت غریزی کے فقدان سے موت واقع ہوتی ہے۔ آلات حس کے اندرونی حرکات سے اور بعض اوقات خارجی محسوسات کی وجہ سے بھی اگر وہ آلہ

مرکزی تک پہنچ جائیں تو سپنے پیدا ہوتے ہیں اس لیے سپنے بعض حالات میں ایسے واقعات کی علامت ہوسکتے ہیں جس کی طرف ہم نے بیداری میں توجہ نہیں کی اور نظرانداز کردیا جب کسی شئے مدرک پر خیریا شر کا اطلاق ہو تو اس سے لذت یا نفرت پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ خواہش جلب یا خواہش دفع ہوتی ہے۔ یہ حالات تاثر کے مرکز سے بھی ظہور میں آسکتے ہیں۔

ارسطو کے نزدیک غیر عقلی خواہشات بعض محض حسی اور بعض اشرف ہوتی ہیں لیکن یہ تمام وظائف، غصہ، شجاعت، جذبہ وغیرہ روح حیوانی سے متعلق ہیں انسان کے اندر اس پر روح عقلی کا اضافہ ہوتا ہے۔ روح حیوانی جسم کے ساتھ ہی پیدا ہوتی اور اس کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے لیکن روح عقلی ازلی اور ابدی ہے تولید سے پیشتر وہ خارج سے نطفے کے اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کی کیفیات میں کچھ تغیر نہیں ہوتا اور جسم کی موت بھی اس پر کچھ اثر نہیں کرتی لیکن انسان کے انفرادی نفس سے رابطہ پیدا کرنے کی وجہ سے وہ تغیرات سے بھی متاثر ہوتی ہے ایک فرد کے اندر فکر کی قوت تفکر سے پہلے موجود ہوتی ہے۔ اس کی روح ایک لوح سادہ کی طرح ہے جس پر سب سے پہلے فکر کا نقش ثبت ہوتا ہے۔ فرد کے اندر فکر ہمیشہ حسی تماثیل کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک نفس وہ ہے جو سب کچھ کرتا ہے اور دوسرا وہ ہے جس پر سب کچھ وارد ہوتا ہے۔ انفعالی نفس جسم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور فنا ہوتا ہے لیکن فعلی نفس ازلی و ابدی ہے چونکہ بحیثیت افراد ہمارا تفکر ان دونوں کے تعاون سے ممکن ہوتا ہے اس لیے روح کی حیات ماقبل کی کوئی یاد ہمارے حافظے میں نہیں۔ اس زندگی سے ماقبل یا مابعد اس غیر جسمی روح کی طرف کوئی ایسا فعل منسوب نہیں کرسکتے جو فقط نفس اور روح کی ترکیب سے ممکن ہوسکتا ہے۔

انسان کے وہ روحانی افعال جو اس کو حیوانی زندگی سے بلند تر کرتے ہیں، عقل کے ساتھ روح کی ادنیٰ قوتوں کے اتحاد پر مبنی ہیں۔ روح کی اصلی فعلیت حقائق عالیہ کا براہ راست وجدان ہے۔ اگر خواہش کے ساتھ عقل شامل ہو تو وہ

ارادہ بن جاتی ہے۔ نیکی ارادی اور اختیاری چیز ہے اس لیے ہم اپنے افعال کے ذمہ دار قرار دیئے جاتے ہیں۔ ارادہ ہی عمل کی غایات کو متعین کرتا ہے جو اہم اخلاقی تصدیقات پر مشتمل ہیں اور ہمارے مقاصد کی صحت کا مدار نیکی پر ہے لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے بہترین ذرائع کا تلاش کرنا تفکر کا کام ہے۔ اس حیثیت میں عقل حکمت عملی کا نام ہے اور دور اندیشی یا بصیرت کا یہ کام ہے کہ وہ اس عقل کی اصلاح کرے۔

ارسطو کی مابعد الطبعیات کے تحریر کردہ کتاب فرسٹ فلاسفی (First Philosophy) جو میٹافزکس کے نام سے مشہور ہوئی دراصل افلاطون کی تھیوری آف آئیڈیاز کے ردعمل میں لکھی گئی۔ ارسطو کے خیال میں میٹافزکس ہی سب سے اہم سائنس ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس سائنس کی ابتدا میں قائم کردہ بنیادی اصول کے بعد تمام نتائج آسانی سے حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ارسطو نے اپنے نظریہ میں مادے کی جگہ وجود (Being) کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے نزدیک حیاتیات کے قوانین کا تعلق صرف جانوروں کے وجود اور ان کی زندگی سے ہے جبکہ فرسٹ فلاسفی کے اصولوں کا تعلق ہر مادی چیز پر ہے۔

ارسطو کے نزدیک کلی کوئی جوہر نہیں ہے' جو ہر ان اشیاء سے خارج نہیں ہو سکتا جن کا کہ وہ جوہر ہے اور تصورات کے اندر وہ قوت محرکہ نہیں پائی جاتی جس کے بغیر وہ مظاہر کی علت نہیں بن سکتے۔ اگر جوہر کا اطلاق فقط اس چیز پر ہو سکتا ہے جو کسی دوسری چیز کا محمول نہ بن سکے اور نہ کسی دوسری چیز کے ساتھ بطور عرض وابستہ ہو سکے تو فقط انفرادی فطرت ہی جوہر کہلا سکتی ہے۔ تمام کلی اور جنسی تصورات جواہر کے محض مشترک صفات کو بیان کرتے ہیں۔ ان تصورات کو محض مجازی اور ثانوی طور پر جواہر کہا جا سکتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک علم کا معروض فقط واجب اور غیر متغیر وجود ہو سکتا ہے جو کچھ حواس سے تدرک ہوتا ہے وہ عارضی اور تغیر پذیر ہے' اس کا ہونا اور نہ ہونا

دونوں ممکن ہیں۔ لیکن جو کچھ حواس سے ماوری ہونے کے باوجود ہمارے فکر کا معروض بنتا ہے وہ تصورات کی طرح غیر متغیر ہے۔ ہر تغیر کے لیے کسی غیر متغیر وجود کا ہونا لازمی ہے اور حدوث کے لیے کسی ایسے محل کی ضرورت ہے جو خود حادث نہ ہو۔ یہ وجود دو طرح کا ہو سکتا ہے ایک تو وہ محل جس پر تغیرات عارض ہوتے ہیں اور جو مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اور دوسرے وہ صفات جو اس محل پر عارض ہو کر تغیرات پیدا کرتے ہیں۔ کوئی چیز اس وقت بنتی ہے جب کہ مادہ صورت اختیار کرتا ہے اس لیے ہر شئے کی حقیقت اس کی صورت ہے لیکن مادہ بحیثیت خود وہ نہیں ہے جو صورت پذیر شئے میں دکھائی دیتا ہے بلکہ وہ ہے جس میں صورت پذیری کی محض استعداد تھی اس لیے محض امکان کی بناء پر اسے ممکن کہا جاسکتا ہے۔ اگر ہم بے صورت مادے کا تصور کر سکیں تو وہ اصل مادہ ہوگا۔ چونکہ اس کی تعریف و تحدید نہیں ہو سکتی اس لیے وہ "کیفاً" غیر محدود ہے اور ہر قسم کے محدود مادے کا مشترک محل ہے۔ چونکہ وہ فقط امکان کا نام ہے اس لیے اس کا کوئی الگ وجود نہیں ہو سکتا۔

ارسطو کہتا ہے کہ چونکہ عالم قدیم ہے اس لیے کوئی صورت کبھی اشیاء سے پیشتر اور ان سے خارج نہیں تھی۔ کسی شئے کی صورت محض اس کا تصور یا جوہر ہی نہیں بلکہ اس کا مقصد اور اس کے تحقق کی قوت بھی ہے۔ چار مختلف قسم کی علتیں مادی، صورتی، فعلی اور غائی ہیں لیکن موخر الذکر تینوں کی اصلیت ایک ہی ہے اور خاص حالات میں یہ تینوں ایک ہی میں ضم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً روح اور بدن یا خدا اور عالم کے تعلق میں حقیقی فرق صورتی اور مادی حالت میں ہے اور یہ فرق ہر شئے میں پایا جاتا ہے

فطرت کے

تحقق مقاصد میں مانع ہوتے ہیں، ان کی علت مادہ ہے۔ فطرت کے تمام

نقائص فلکی اور ارضی، نر اور مادہ کا اختلاف اسی کے باعث سے ہے۔ مادے کی مزاحمت کی وجہ سے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی نہایت سست رفتاری سے ہوتی ہے۔ ادنی ترین نوعی تصورات کا افراد میں منتشر اور متعدد ہو جانا بھی مادے ہی کی بدولت ہے اس طرح مادہ بھی قوت رکھتا ہے۔

صورت اور مادے کے باہمی تعلق سے تمام حرکت یا بالفاظ دیگر وہ تمام تغیر پیدا ہوتا ہے جو عالم مظاہر میں پایا جاتا ہے۔ حرکت دراصل امکان کے حقیقت پذیر ہونے کا نام ہے اس تحقق کی محرک وہی چیز ہو سکتی ہے جو پہلے ہی سے وہ ہے جو شئے متحرک ہونا چاہتی ہے اس لیے ہر حرکت کے لیے دو چیزیں مقدم ہیں ایک عنصر محرک اور ایک عنصر متحرک۔ اگر وجود مطلق متحرک بالذات بھی ہے تو یہ دونوں عناصر اس میں الگ الگ ہوں گے جیسے کہ انسانوں میں روح اور بدن ہے۔ حرکت دینے والا عنصر ہی حقیقی ہے اور وہی صورت ہے جس عنصر کو حرکت کی جاتی ہے۔ اس کا وجود بالقوے یا مادی ہے۔ صورت کے جذب کی وجہ سے مادہ حقیقت یا اس کی طرف حرکت کرتا ہے۔ مادے کی فطرت میں خیر اور خدا کی طرف ایک میلان یا خواہش کی جاتی ہے۔ صورت اور مادہ کے اتصال کے ساتھ ہی حرکت کا پیدا ہونا لازمی ہے نہ صرف صورت اور مادہ بلکہ ان دونوں کا تعلق بھی جن سے حرکت پیدا ہوتی ہے قدیم ہے اسی طرح زمانہ اور عالم دونوں حرکت کے بغیر موجودہ نہیں ہوسکتے۔ اس لیے ان کا بھی نہ آغاز ہے اور نہ انجام۔ اس ازلی حرکت کی علت اولیٰ فقط ایسا وجوہ ہوسکتا جو خود حرکت نہ کرے۔ ہر متحرک کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہے اگر علت اولیٰ خود بھی متحرک ہو تو اس کو بھی حرکت دینے والی کوئی دوسری چیز ہونی چاہیے۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ علت اولیٰ نہیں۔ ہمیں لازماً" ایک ایسے محرک پر پہنچنا پڑے گا' جو خود حرکت نہ کرے۔ اگر محرک اول خود بے حرکت ہو تو وہ صورت بے مادہ یا خالص واقعیت ہوگی کیونکہ یہاں کہیں مادہ ہے وہاں تغیر اور حرکت کا ہونا اور اشیاء کا بالقوے سے بالفعل وجود میں آنا لازمی ہے۔

فقط غیر مادی وجود غیر متغیر اور غیر متحرک ہو سکتا ہے۔ چونکہ صورت وجود کامل ہے اور مادہ وجود ناقص۔ اس لیے جو علت محرک اول ہے وہ لازما" کامل مطلق ہوگی چونکہ تمام عالم یکساں اور منظم ہے اور ایک واحد مقصد کے ماتحت چلتا ہے اور کرۂ عالم کی حرکت یکساں اور مسلسل ہے اس لیے محرک اول بھی ضرور واحد ہوگا۔ لیکن فکر یا روح کے سوا خالص اور کامل روح اور لامتناہی قوت رکھنے والی ہستی ہے۔ اس روح کامل کی فعلیت فقط فکر پر مشتمل ہو سکتی ہے کیونکہ دیگر ہر قسم کی فعلیت کا معروض اس سے خارج میں ہوتا ہے۔ فکر الٰہی محض بالقوے نہیں ہو سکتا وہ ایک مسلسل تفکر بالفعل ہے۔ وہ آپ ہی اپنا معروض ہے۔ فکر کی قیمت مفکور کی قیمت کی نسبت سے ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ قیمتی اور کامل مفکور خود خدا ہی کی ذات ہو سکتی ہے وہ اپنے فکر یا ارادے کو اپنے سے خارج میں کسی چیز پر بھی لگائے اس کا عمل محض اس کے وجود سے ہوتا ہے۔ چونکہ یہ وجود کامل خیر برتر بھی ہے اس لیے وہ تمام اشیاء کا آخری مطلوب بھی ہے۔ ہر چیز اسی کی طرف جانے کی کوشش کر رہی ہے عالم کے اندر تمام نظم و ربط اور زندگی اسی سے ہے۔ ارسطو کے اس تصور الوہیت میں خدا اس طرح صاحب ارادہ نہیں کہ وہ اپنا ارادہ عالم پر لگاتا ہو' نہ اس کے اندر کوئی تخلیقی فعلیت ہے اور نہ وہ عالم کے کاروبار میں مداخلت کرتا ہے۔

ارسطو نفسیات کے باب میں کہتا ہے کہ ہم بلاواسطہ اپنے ارادے سے اس سے مختلف نہیں ہو سکتے جو کچھ ہم ہیں۔ ہم اس ماحول کا انتخاب کر سکتے ہیں جو ہمیں سانچے میں ڈھالتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم نے کیا بننا ہے۔ اس کے نزدیک روح ہر عضویے کی اصل موثر کی کلیت ہے۔ پودوں میں روح محض قوت تعزیہ و تولید کا نام ہے جبکہ جانداروں میں روح حرکت کی قوت کا ماخذ اور انسانوں میں استدلال اور فکر کی طاقت ہے۔ تخلیقات فنی کا ماخذ تحریک تشکیل ہے اور جذبے کے اظہار کی آرزو اصلا" آرٹ یا فن حقیقت کی نقالی ہے۔ آرٹ یا فن کا مقصد حقائق و اشیاء کی باطنی معنویت کا اظہار کرنا ہے۔

ارسطو کے مطابق دنیا کی ہر چیز کا ایک مقصد اور عمل ہے اور مقصد صورت (Form) میں موجود ہے۔ مادہ جب صورت کے ذریعے اظہار کرتا ہے تو تخلیق کا عمل پورا ہوتا ہے۔ کائنات میں فقط انسان شعوری طور پر اپنے ذاتی مقاصد سے آگاہ ہے۔ چیزیں مثلاً انسان، حیوان، ستارے، سیارے کی نوع ابدی ہے ان کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا۔ انسان پیدا ہوتا ہے پھر مرجاتا ہے لیکن انسان کی نوع ختم نہیں ہوتی۔ ہر انسان خوشی کا متلاشی ہے اور اصل خوشی اچھے کام سے حاصل ہوتی ہے اور ہر چیز کی اچھائی یہ ہے کہ وہ اپنا کردار درست طریقہ سے ادا کرے۔ نیکی کا مطلب سفلی جذبات اور حیاتی بھوک پر عقلی استدلال سے آہستہ آہستہ اور مسلسل کوشش اور مجاہدے سے قابو پانا ہے اور بصیرت نیکی کی علت بھی ہے اور معلول بھی۔

اخلاقیات (Ethics) میں ارسطو نے ان مثالی اصولوں کا ذکر کیا ہے جن کو اپنا کر فرد اپنی زندگی فطری اصولوں کے مطابق بسر کرسکتا ہے۔ اس کے نزدیک فطرت انسانی زندگی پر محیط ہے اور فطری اصول حیات انسانی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ نصب العین کے حصول کے لیے ان فطری اصولوں اور قوانین پر عمل درآمد کرے تاکہ غیر اخلاقی اور بے مقصد زندگی سے بچ سکے۔ یہی فطری اصول اور قوانین مستحکم معاشرہ کے قیام میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں اور ان ہی کے ذریعے مملکتی مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ انسان چونکہ اپنی فطری خودغرضی کی وجہ سے مثالی اشیاء کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا ہے اس لیے اس کا فطری اور اخلاقی اصولوں پر کاربند رہنا فطرت کا تقاضا ہے اور فطرت کی تکمیل ہی دراصل اخلاقی زندگی کی معراج ہے۔

ارسطو کے نزدیک عام طور پر مسرت یا سعادت تمام افعال انسانی کی غائت ہوتی ہے۔ اسباب سعادت کا تعین افعال حیات کی خارجی صورت سے ہوتا ہے۔ سعادت ہستی کے جمال و کمال سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ اس کا نتیجہ ہے۔

انسان کے لیے خیر کا نصب العین یہی ہے کہ وہ مخصوص انسانی افعال میں کمال پیدا کرے۔ عقل انسان کی خصوصیت ہے اور جو افعال عقل کے مطابق ہوں وہی نیکی ہیں۔ انسانوں کی سعادت کا مدار نیکی پر ہے۔ اگر افعال یا فضائل کو نظری اور عملی طور پر دیکھا جائے تو فکر کی خالص یا حکمی فعلیت مقابلتاً" زیادہ باقیمت ہے اور اخلاقی نیکی یا عمل سعادت کا دوسرا لازمی عنصر ہے۔ زندگی کی پختگی اور اس کی تکمیل بھی سعادت کا ایک جزو ہیں۔ ان کے خیال میں افلاس بیماری اور مصیبت سے سعادت میں خلل پڑتا ہے اور ان کی وجہ سے نیکی کو وہ مدد میسر نہیں رہتی جو دولت قوت اور اثر سے اس کو حاصل ہوتی ہے۔ بچوں کی موجودگی احباب کی صحبت، صحت حسن اور شریف النسب ہونا فی نفسہٖ بیش بہا چیزیں ہیں لیکن باطنی کمال سعادت کا حقیقی اور ایجابی عنصر ہے خارجی اور مادی اسباب محض سلبی شرائط ہیں۔ انتہائی مصیبت بھی نیک آدمی کو مصیبت زدہ نہیں بنا سکتی۔ لذت خیر اعلیٰ کا کوئی ایسا عنصر نہیں کہ اس کو الگ کر کے مقصدِ عمل بنا سکیں۔

ارسطو کے نزدیک جن صفات پر سعادت کا مدار ہے وہ فکر اور ارادے کی خوبیاں ہیں۔ اخلاقیات کا تعلق موخر الذکر سے ہے۔ نیکی ارادے کی ایک صفت ہے اور ہماری فطرت کے مطابق عقل کے مقرر کردہ اعتدال یا وسط پر مشتمل ہے۔ ایک حکمت شناس شخص اس وسط کا تعین کر سکتا ہے۔

ارسطو کے مطابق تمام فضائل کا مدار بعض فطری قابلیتوں پر ہوتا ہے لیکن صحیح معنوں میں فضائل وہی ہیں جن کے ساتھ عقلی بصیرت شامل ہو۔ خالص اخلاقی نیکی کا مقام ارادہ ہے۔

اس کے نزدیک اخلاق اس بات کا نام ہے کہ افراط اور تفریط کے درمیان بین بین راستہ اختیار کیا جائے۔ ہر فضیلت دو نقائص کے درمیان واقع ہوتی ہے جن میں سے کبھی ایک اور کبھی دوسرا اس سے زیادہ بعید ہوتا ہے۔ وہ عدل پر جو آئینی زندگی کی سب سے بڑی فضیلت ہے بڑی تفصیل سے بحث کرتا ہے اور اپنی

اخلاقیات کا پانچواں حصہ اسی کے لیے وقف کرتا ہے۔ یہ کتاب از منہ متوسط میں فطری قانون کی بنیاد قرار دی گئی۔ ارسطو کے نزدیک عدل جزا و سزا کا صحیح تعین ہے۔ ایک قسم کا عدل صحیح تقسیم پر مشتمل ہے اور دوسرا تصحیح یا اصلاح پر۔ اعزازات و مفادات فرد کی قابلیت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ معاہدات میں نفع و ضرر کا توازن یکساں ہونا چاہیے اور قانونی فیصلوں میں جرم اور سزا کی نسبت برابر ہونی چاہی۔ جہاں قانونی عدل سے کچھ ناانصافی ہوتی ہو وہاں فطری عدل سے اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

ارسطو نے اس کتاب میں زنانہ پن ؟ محبت اور دوستی پر نہایت خوبصورتی سے بحث کی ہے اور اس میں نہایت لطیف اور برجستہ باتیں لکھی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی فطرت اجتماعی ہے' ہر انسان دوسرے انسان سے ربط رکھتا ہے۔ ایک عدل مشترک تمام انسانوں کو متحد کرتا ہے اور یہی خصوصیت کنبے اور مملکت کی بنیاد ہے۔

ارسطو کی سب سے اہم تصنیف سیاسیات (Politics) ہے۔ یہ کتاب حکومت کرنے کے فن پر اسرار و رموز کا اک خزانہ ہے بلکہ اسے اگر سیاستدان کی درسی کتاب کہا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ یہ کتاب پندرہ سال میں مکمل ہوئی اور اس کے لیے اس نے یونانی شہری ریاستوں کے 57 دستوروں کا مطالعہ کیا۔ ڈننگ کے الفاظ میں ارسطو کی عظمت کا راز اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اس نے علم سیاسیات کو ایک مستقل سائنس کا درجہ دیا۔

یہ کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ ان آٹھ حصوں کو فکری نوعیت کے اعتبار سے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے بڑے حصے میں پانچ ابواب اور دوسرے بڑے حصے میں تین ابواب ہیں۔ پہلے بڑے حصہ میں پہلا' دوسرا' تیسرا' ساتواں اور آٹھواں باب جبکہ دوسرے بڑے حصے میں چوتھا' پانچواں اور چھٹا باب شامل ہیں۔ فکری لحاظ سے اس کتاب کے بعض حصوں میں اخلاقیات اور

سیاسیات کو اکٹھا اور بعض حصوں میں الگ الگ پیش کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں ریاست کی نوعیت' آغاز اور اس کی اندرونی تنظیم' دوسرے باب میں اس وقت کی ریاستوں کے جائزے اور تیسرے باب میں مثالی ریاستوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ چوتھے' پانچویں اور چھٹے بابوں میں ریاست کی ساخت' ہر آئین کی نوعیت اور مختلف ریاستوں میں انقلاب کی وجہ سے سیاسی رد و بدل پر بحث کی گئی ہے۔ ساتواں اور آٹھواں حصہ مثالی ریاست سے متعلق ہے۔ ابتدا میں افلاطون کی تقلید اور بعد میں اس کے اپنے مشاہدات و تجربات اور مختلف ذہنی ادوار کے خیالات مذکور ہیں۔ اس کتاب کے چوتھے' پانچویں اور چھٹے باب' دوسرے' تیسرے' ساتویں اور آٹھویں بابوں کے بعد لکھے گئے۔ تمہیدی باب سب سے آخر میں لکھا گیا۔ دوسرے اور تیسرے بابوں میں مختلف مثالی ریاستوں پر بحث کی گئی ہے۔ درمیانی تین حصوں میں اس کے وسیع تجربات اور معلومات درج ہیں۔ پہلے تین اور آخر کے دو باب میں اخلاقیات' نیکی اور اچھائی کے اصول کے سیاسی مسائل پر بحث کرتے ہوئے بدترین اور ناقص ترین دستور کو پائیدار اور مستحکم بنانے کی تدابیر دی گئی ہیں۔ درمیانی بابوں میں مملکت کو انسانی جسم سے متشابہ قرار دیتے ہوئے اس کی اس طرح نشوونما پر زور دیا گیا ہے جس طرح کہ انسانی جسم ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کتاب کے آخری دو باب افلاطون کی تصنیف "قانون" کی اشاعت کے بعد تحریر کیے گئے تھے اس لیے ان حصوں کی تحریروں میں "قانون" کا اثر نمایاں ہے۔

Jaeger کے مطابق اس کتاب کا پہلا حصہ سیاسی تصورات پر اور دوسرا حصہ سیاسی حقائق پر مبنی ہے۔ پہلے حصہ میں باب II' III' VI اور VII جبکہ دوسرے حصہ میں باب IV' V اور VIII شامل ہیں۔ پہلے حصہ میں اس نے خود مختار فلسفہ بیان کیا ہے جبکہ دوسرے حصہ میں نظام ہائے حکومت پر حتمی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ارسطو نے اپنی اس مایہ ناز تصنیف میں آغاز مملکت کے بنیادی مقاصد مملکت کی ہیئت، رسمی خدوخال اور اس کی نوعیت پر بحث کی ہے۔ وہ اس کتاب میں مملکت کی نوعیت و اہمیت میں تجزیاتی طرز استدلال استعمال کرتے ہوئے اجزا کی نسبت پر بحث کرتا ہے۔ اس کے آغاز مملکت کے باب میں ان نظریات "مملکت کا ارتقا فطری ہے، خاندان مملکت کی اکائی ہے۔ اور مملکت انسانی ضروریات کی تکمیل کا واحد ادارہ ہے" کی مسلمہ حیثیت کو جدید دور میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اس کتاب میں حکومت کے باضابطہ تصور کی بجائے مملکت کی نسبت سے ہی حکومت کی اصطلاح استعمال کی ہے اور تقسیم مملکت میں حکمران طبقے کی اہلیت اور ان کے ارادے کی نسبت سے مملکت کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ اس نے حکمران طبقے کے مقاصد کا جو اصول تجویز کیا ہے اس پر آج بھی عملدرآمد ہو رہا ہے۔

ارسطو نے تصور شہریت کو اس کتاب کے تیسرے باب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس میں بلاشبہ کوئی ابہام نہیں کہ یہ تصنیف اپنے محاسن کے اعتبار سے ایک منفرد تصنیف ہے جس میں ارسطو نے جہاں آغاز مملکت، تقسیم مملکت، غلامی اور شہریت کے تصورات فلسفہ حقیقت کی بنیاد پر پیش کرکے ایک نئے مکتبہ فکر کی بنیاد ڈالی وہاں انقلاب کا تصور استقراری طریقہ مطالعہ کی بنیاد پر پیش کرکے فلسفہ سیاسیات کے معروضی مطالعہ کی راہ ہموار کی۔

ارسطو نے اس کتاب کے پانچویں باب میں انقلابات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے نزدیک انقلاب ذو معنی ہے۔ اس کے نظریہ انقلاب کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں چند سری حکومت، جمہوریت، اشرافیہ کے حاکموں، بادشاہوں اور جابر حکمرانوں کے لیے عملی ہدایات ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں اچھی اور مستحکم حکومت کی فلسفیانہ بنیادوں پر بحث کی گئی ہے۔ اس باب اور میکاویلی کی "دی پرنس" کے بنیادی تصورات جن میں اقتدار کو دائمی بنانے کے لیے اخلاقی اصولوں کو پس پشت ڈالنے کی تلقین کی گئی ہے، میں کوئی فرق نہ ہونے کی وجہ سے

ارسطو کو میکاویلی کا پیشرو بھی کہا جاتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ ارسطو نے سیاسیات کو اخلاقیات سے الگ کرکے ایک جداگانہ اور وسیع علم کی حیثیت دی اور سیاسی و سماجی نظام کے مختلف عناصر اور تمام اجزاء کا استقراری طریقہ استدلال کی بنیاد پر مطالعہ کرکے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے انہیں مزید فعال و متحرک اور افادی بنانے کے لیے تصورات پیش کئے ہیں جن کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس نے اس باب میں انقلاب کی بنیادی نوعیت کی دو قسمیں مکمل انقلاب اور نامکمل انقلاب کو بیان کرتے ہوئے کچھ جزوی اقسام بھی بیان کی ہیں جو بلاشبہ بامعنی اور اہمیت کی حامل ہیں۔ اس نے بدترین طرز حکومت کو بھی برقرار رکھنے اور انقلاب سے بچانے کی ٹھوس تجاویز پیش کی ہیں۔ اس کا تصور انقلاب حقیقت کے اتنا قریب تر ہے کہ اس پر تنقید کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

ارسطو نے اپنی اس تصنیف میں ایک مثالی ریاست کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس ریاست میں نہ تو زیادہ امیر ہوں اور نہ ہی زیادہ غریب۔ بیرونی حملے سے بے خوف ہو زیادہ دولت کے حصول کی خواہش یا تجارت اور اراضی کے لیے توسیع پسندانہ عزائم نہ رکھتی ہو۔ پاکیزہ اور متمدن ملت ہو' خود مختار ہو' جارحیت پسند نہ ہو' عظیم ہو لیکن بے قابو نہ ہو۔ عظیم فرمانروا ہو جس کے ماتحت خود کو ہوس زر سے بچاتے ہوئے بہترین تمدن' عوامی فلاح و بہبود اور مملکتی خوشحالی کے لیے وقف کردیں اور عوام ریاست کی بقا کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ وہ ریاست کو بہترین صورت اور گمراہ صورت میں تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بادشاہت' اشرافیہ اور آئینی جمہوریت بہترین جبکہ جابرانہ اور چند سری بدترین نظام ہائے حکومت ہیں۔ اس کے نزدیک دستوری حکومت ہی سب سے بہتر نظام حکومت ہے اور بہترین آئین وہ ہے جسے مثالی قرار دیا جائے اور مثالی آئین وہی ہوتا ہے جو دیرپا ہو۔

ارسطو کے نزدیک ریاست کو بہت بڑے رقبے یا آبادی پر مشتمل نہیں ہونا چاہیے اور ریاست کی آبادی کو شرح پیدائش پر قابو رکھ کر محدود رکھنا چاہیے۔ ریاست کا رقبہ صرف اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ آزاد اور تفریحی زندگی گزاری جاسکے۔ ریاست سمندر کے قریب ہونی چاہیے تاکہ درآمدات ہوسکیں لیکن اس قدر قریب نہ ہو کہ بیرونی تجارت شروع ہو جائے۔ ہر شہری کے پاس زمین ہونی چاہیے جس پر وہ اپنے غلاموں کے ذریعے کاشت کرسکے۔ اس کے نزدیک کاشتکار اور کاریگر شہریت کے اہل نہیں ہیں اور حق شہریت صرف فوجیوں، متمول تفریحی جماعتوں، دینی پیشواؤں اور منتظمین کو حاصل ہیں۔ وہ اپنی مثالی ریاست کے لیے یکساں، لازمی اور قومی تعلیم کا خواہاں ہے۔ اس نے اپنی مثالی ریاست کی تصویر کشی سیاسیات کے باب III، VII اور VIII میں کی ہے۔

ارسطو کے خیال میں ریاست صورت اور فرد مادے کی مانند ہے۔ ریاست کا بنیادی مقصد عوامی فلاح و بہبود اور خوشحالی ہے اور فرد اپنی شخصیت کی تکمیل ریاست کے شہری کی حیثیت سے ہی کرسکتا ہے۔ ریاست وہ ادارہ ہے جو اپنے شہری کو پہلے نیکی اور اچھائی کی تعلیم دیتا ہے اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ فرد ریاست کے بغیر وحشی جانور کی مانند ہے جبکہ ریاست اپنے شہری کو ایک انسان بناتی ہے اور اسے انسان کا درجہ عطا کرتی ہے۔

ارسطو کے مطابق ریاست کی بنیادی اکائی ایک خاندان ہے جس کی ابتدا ایک فرد سے ہوتی ہے فرد شادی کرکے خاندان بناتا ہے۔ خاندان میں اس کے بیوی بچے اور غلام شامل ہوتے ہیں۔ بہت سے خاندان مل کر ایک گاؤں اور بہت سے گاؤں مل کر ایک شہر (City or Polis) وجود میں آتا ہے اور یہی ریاست یا سٹیٹ (State) ہے۔ (یہاں یہ امر قابل ذکر ہوگا کہ قدیم یونانی شہروں کو ہی ریاست کی اصل صورت قرار دیتے تھے۔)

ارسطو کے خیال میں خاندان اور گاؤں ریاست کا مواد یا مادہ ہیں۔ وہ وقت

لحاظ سے ریاست سے پہلے ہیں لیکن چونکہ ریاست ایک فرد' ایک خاندان' ایک گاؤں کا وہ آخری اور اصلی مقصد ہے جس کی طرف یہ سب چیزیں پیش رفت کرتی ہیں اس لیے ریاست اس تمام مادے کی صورت (Form) کی مانند ہے جس کے ذریعے یہ مادہ اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے ریاست فرد' خاندان یا افراد سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ یہی وہ ادارہ ہے جو اپنے شہریوں کو نیکی کی تعلیم دے کر پھر ان کو نیکی پر عمل کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ریاست باقاعدہ ایک ادارہ ہے اور یہ اپنے مختلف حصوں کی مدد سے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ ریاست کی اپنی ایک زندگی ہے اور اس کے تمام ارکان کی بھی اپنی زندگیاں ہیں اور یہ سب ریاست میں شامل ہیں۔

ارسطو کے نزدیک ریاست ایک نامیاتی جسم ہے اس نامیاتی جسم کا ہر عضو بذات خود ایک نامیاتی جسم ہے اور ہر عضو کا دوسرے عضو کے ساتھ جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ ریاست اپنے علیحدہ مقاصد رکھتی ہے اور اس کے تمام اعضا اپنے اپنے مقاصد رکھتے ہیں۔ ریاست کا بنیادی مقصد عوام کا اجتماعی مفاد ہے جبکہ ریاست کے عوام کے ہر فرد کا ایک ذاتی مقصد یا مفاد بھی ہے جو ریاست کے بنیادی مقصد کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے علیحدہ ہے۔ ریاست چونکہ ہم نوع اور ہم فطرت کا اتحاد ہے اس لیے ریاست کے آگے فرد یا افراد کے حقوق کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

ارسطو کے خیال میں ریاست کی کل چھ قسمیں ہیں جن میں اصل قسمیں تین ہیں اور دوسری تین اصل تین قسموں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ ریاست کی پہلی اصل قسم بادشاہت ہے جس کی بگڑی ہوئی شکل استبدادیت ہے۔ ریاست کی دوسری اصل قسم اشرافیہ ہے جس کی بگڑی ہوئی قسم چند سری ہے۔ ریاست کی تیسری اصل قسم آئینی حکومت ہے جس کی بگڑی ہوئی شکل جمہوریت ہے۔ بادشاہت میں بادشاہ قانون اور اخلاقی طور پر اپنی ذہانت' لیاقت' بہادری اور نیکی کی بدولت عوام پر حکومت کرتا ہے جبکہ استبدادیت میں ظالم اور جابر حکمران کسی اعلیٰ ارفع عقلی اور

اخلاقی صلاحیت کے بغیر عوام کی مرضی کے خلاف حکمرانی کرتا ہے۔ اشرافیہ میں نیک اور اچھے قسم کے امراء اصولوں اور ضابطوں کے ذریعے ریاست پر حکومت کرتے ہیں جبکہ چند سری حکومت میں چند عاقبت نااندیش' خودغرض اور خودپرست حکمران ہوتے ہیں۔ آئینی جمہوریت میں ایک ایسی قانونی اور باضابطہ عوامی جمہوریت ہوتی ہے جس میں ہر شہری فطری' ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے باعث اپنے حقوق کا دفاع کرتا ہے اور اسے اپنے فرائض کا شعور ہوتا ہے۔ اس ریاست کا ایک باقاعدہ آئین ہوتا ہے جبکہ جمہوریت ایک جاہل ہجوم کی حکومت ہوتی ہے۔

فاسٹر کے مطابق ارسطو نے اپنی اس تصنیف میں فرد کی خوشی اور خوشحالی پر زور دیا ہے اور ریاست کو خوشی اور خوشحالی کے حصول کا ذریعہ بتایا ہے۔ ارسطو کی یہ کتاب تخیلی اور عملی دونوں عناصر سے مالا مال ہے۔ ڈاکٹر ٹیلر کا موقف ہے کہ یہ تصنیف اتنے وسیع موضوع پر بہت معمولی کتاب ہے۔ بارکر کے مطابق لیکچروں کے تین واضح مجموعوں کو سیاسیات میں جمع کر دیا گیا ہے جبکہ ڈاکٹر راس اسے پانچ مختلف مقالات کا مجموعہ لکھتے ہیں۔

اس عظیم کتاب کا 13ویں صدی میں عربی اور پھر لاطینی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ ارسطو کو یورپ میں متعارف کرانے کا سہرا اس کے شاگرد سینٹ تھامس ایکوناس کے سر پر ہے جس کی تصانیف نے چرچ کی تعلیم اور ارسطو کی تعلیم میں ربط پیدا کیا اور ارسطو سے کیتھولک یورپ متاثر ہوا۔ بارکر کے مطابق "ارسطو نے سینٹ تھامس کو سکھایا۔ سینٹ تھامس کے ذریعے اس نے کیتھولک چرچ کو سکھایا۔ سینٹ تھامس ہی کے ذریعے اس نے رچرڈ ہوکر کو سکھایا جس نے اس ماخذ سے قانون اور حکومت کا نظریہ اخذ کیا۔ لوک ہوکر کا شاگرد تھا جس کا نظریہ برک نے اپنایا۔ اس طرح ارسطو کی سیاسیات اور انگریزی سیاسی افکار کے درمیان تیرھویں اور اٹھارویں صدی میں نہ صرف مشابہت ہے بلکہ الحاق بھی ہے۔ ارسطو سے دانتے" میکاویلی' بودین اور ہیرنگٹن متاثر ہوئے اور ہیگل نے اس کے طرز فکر کو

کسی حد تک اپنایا۔ اس طرح ایکوناس سے برک تک سارے کا سارا فلسفہ کسی نہ کسی طرح ارسطو کے فلسفہ سے متاثر ہے۔ بلاشبہ "سیاسیات" علم سیاسیات پر ایک بیش قیمت، عظیم اور مایہ ناز کتاب ہے۔"

بوطیقا (335-332 ق م) ارسطو کی وہ تصنیف ہے کہ جس کا اثر آج تک جاری و ساری ہے۔ اس کتاب میں فن شاعری کا ایک مکمل اور مربوط نظریہ موجود ہے اس نے فن شاعری کا جواز پیش کرتے ہوئے افلاطون کے شعری کے بارے میں اس دعوی کو کہ شاعر جھوٹا اور حقیقت سے تین درجے ہٹا ہوا ہوتا ہے کو باطل قرار دیا اور شاعری کو ذہنی صحت کے لیے شفا بخش قرار دیا۔ اس نے شاعری کو ذہنی تسکین قرار دیتے ہوئے کتھارسس کی اصطلاح وضع کی۔ جسے جدید نفسیات میں ارتفاع (Subliation) کا نام دیا گیا ہے۔ ارسطو کے نزدیک شاعری کی ضرورت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی کیونکہ یہ انسانی ذہن میں امید و ہمت کی لہر کو مہمیز کرتی ہے اور یہی دراصل کتھارسس ہے۔

ارسطو نے شاعری کے دفاع میں اس کتاب میں یہ نظریہ اختیار کیا کہ شاعر جھوٹا نہیں ہوتا کیونکہ جو وہ کہتا ہے مستقبل میں ممکن بھی ہو سکتا ہے یہ کتاب بنیادی طور پر شاعری کے دفاع میں لکھی گئی ہے۔ جس پر آج بھی اتفاقی یا اختلافی تنقید جاری ہے۔

"بوطیقا" کے کل پچیس چھوٹے چھوٹے باب ہیں جن میں واضع کیا گیا ہے کہ "شاعری ایک قدرتی عمل ہے، سارے فنون نقل کی صورتیں یقیناً ہیں لیکن سارے فنون نقل کے ایک دوسرے سے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہیں، مختلف چیزوں کی نقل کرتے ہیں اور یہ نقل کے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کا ذریعہ زبان ہے جس میں بحر کی وجہ سے موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ شاعر انسان کو حالت عمل میں پیش کرتا ہے۔ کامیڈی کا مقصد انسان کو اس سے بدتر اور ٹریجڈی کا مقصد ان کو بہتر دکھاتا ہے۔ اس فن کا تعلق انسانی فطرت سے ہے۔ نقل کرنے کی

جبلت انسان میں ازل سے موجود ہے۔ وہ ساری مخلوق میں سب سے زیادہ نقال ہے اور نقل سے وجود میں آنے والے کاموں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ شاعری کا موضوع جتنا بلند ہوگا نظم بھی اتنی ہی بلند ہوگی۔ سنجیدہ شاعر شائستہ اعمال اور اعلی لوگوں کے کاموں کو پیش کرتے ہیں جبکہ کم ذہن شاعر ادنیٰ لوگوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

ارسطو کے نزدیک ٹریجڈی ترس اور خوف کے جذبات کو ابھار کر ایسے مقام پر لے آتی ہے جہاں جذبات امید و ہمت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے ٹریجڈی میں کردار' پلاٹ' طرز' خیال' تماشا' گیت اور ہیئت مجموعی کی موزونیت بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک ٹریجڈی جذبات کو "فارم" عطا کرتی ہے جس کے باعث شاعری انسان کے اندر توازن پیدا کرتی ہے۔ آفاقی صداقتوں پر مبنی ہونے کے باعث شاعری تاریخ کے مقابلے میں زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ لائق توجہ ہے۔ ارسطو کے خیال میں زندگی کی کوئی فارم نہیں ہے جبکہ ٹریجڈی میں آغاز' وسط اور خاتمہ ہوتا ہے اور ہر حصہ ایک دوسرے سے پیوست ہے۔ شاعر کی غلطی صرف اس وقت غلطی ہے جب وہ نقل کرنے کی صلاحیت میں ناکام ہو۔ شاعر محض نقال نہیں ہے بلکہ وہ نقل کے ذریعے عالم مثال تک پہنچتا ہے۔

ارسطو نے بوطیقا میں نقل' پلاٹ' سقم اور تزکیہ کی پانچ بنیادی اصطلاحوں کا استعمال کیا جن پر آج بھی بحث جاری ہے خصوصاً مغرب میں تنقید یا تو ارسطو سے اتفاق کے نتیجے میں یا اختلاف کے نتیجے میں یا پھر ان دونوں کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ بوطیقا میں ارسطو نے نقل' شاعری کی اصل' شاعری کی اقسام اور ٹریجڈی کے اصولوں پر بحث کرتے ہوئے شاعری کا ایک آفاقی نظریہ پیش کیا ہے۔ ارسطو کے نزدیک نقل کا مطلب حقیقی خیال کے مطابق پیدا کرنا' تخلیق کرنا ہے جبکہ فطرت کا مطلب تخلیقی قوت اور تخلیقی اصول۔ ارسطو کے نزدیک شاعر کا کام ایسی چیزیں بیان کرنا ہے جو ہو سکتی ہیں۔

شاعری اور تاریخ میں واضح فرق یہی ہے کہ تاریخ اس چیز کو بیان کرتی ہے جو ہو چکی ہے جبکہ شاعری اس قسم کی چیزوں کو سامنے لاتی ہے جو ہو سکتی ہیں۔ شاعری آفاقی صداقتوں سے جبکہ تاریخ مخصوص واقعات سے سروکار رکھتی ہے۔ ارسطو کے خیال میں پلاٹ کو ایک وحدت کا مظہر ہونا چاہیے۔ اس کے مختلف واقعات کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے کہ اگر ان میں سے کسی کو بھی خارج کر دیا جائے تو وحدت کا اثر خراب ہو جائے۔ نیز اسے محض سن کر کوئی شخص صرف واقعات کی بنا پر خوف اور ترس کے عالم میں آجائے۔

بوطیقا کے پہلے، دوسرے اور تیسرے باب میں شاعرانہ نقل کے ذرائع، عوامل اور طریقوں پر بحث کی گئی ہے۔ ارسطو کے نزدیک کچھ فنکار یا تو نظریاتی علم سے یا پھر طویل مشق سے اشیاء کی شکل اور ان کے رنگ کی نقل کی ادائیگی پر قدرت رکھتے ہیں اور دوسرے فنکار یہی عمل آواز کے استعمال سے کرتے ہیں۔ فن کی وہ صنف جو صرف زبان سے تعلق رکھتی ہے، چاہے زبان نثر ہو یا نظم اور نظم خواہ مختلف بحروں کا مجموعہ ہو یا ایک خاص قسم کی بحر کا، اب تک بے نام ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام لوگ شاعری کا تعین بحر سے کرتے ہیں اور اس طرح نوحہ خواں شاعر یا رزمیہ شاعر کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ انہیں شاعر اس لیے نہیں کہتے کہ وہ نقل پیش کرتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بحریں استعمال کرتے ہیں، کیونکہ وہ لوگ بھی شاعر ہی کہلاتے ہیں جو طبی اور سائنسی مضامین نظم میں لکھتے ہیں۔ تاہم ہومر اور ایمپی ڈوکلز کے کلام میں سوائے بحر کے کوئی چیز مشترک نہیں ہے اور اس لیے اگر ایک کو شاعر کہنا درست ہے تو دوسرے کو شاعر سے زیادہ فطری فلسفی کہنا درست ہوگا۔ اسی طرح ایک ایسا مصنف جو اپنی نقل میں مختلف بحریں استعمال کر کے پیش کرتا ہے کو بھی شاعر ہی کہا جائے گا۔

ارسطو کے نزدیک غنائی شاعری، ٹریجڈی اور کامیڈی ایسے فنون ہیں جو وزن، موسیقی اور باقاعدہ بحروں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ البتہ غنائی اصناف ان

تمام ذرائع کو ایک ساتھ استعمال کرتی ہیں جبکہ ٹریجڈی اور کامیڈی ان کو الگ الگ، یکے بعد دیگرے استعمال میں لاتی ہیں۔

ارسطو کے نزدیک چونکہ "نقل کرنے والے فنکار" انسانوں کو عمل کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں اور یہ انسان لازماً "یا تو "نیک" یا پھر "بد" ہوتے ہیں لہٰذا ان انسانوں میں یا تو ہم سے بہتر یا ہم سے بدتر یا پھر اسی قسم کے لوگ، جیسے ہم خود ہیں، پیش کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کی نقل میں، اس قسم کا فرق اور اختلاف لازمی ہے اور اس طرح وہ قسمیں بھی ان اشیاء کے فرق کے مطابق، جن کو وہ پیش کرتی ہیں، مختلف ہوں گی۔ یہ تنوع رقص میں بھی ہو سکتا ہے اور بانسری اور لائر سے پیدا کی ہوئی موسیقی میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اس فن میں بھی ہو سکتا ہے جس کی بنیاد زبان ہے، چاہے وہ نثر ہو یا نظم جس میں موسیقی استعمال نہ کی گئی ہو۔ یہی بات غنائی شاعری میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو کامیڈی اور ٹریجڈی میں امتیاز پیدا کرتا ہے، کیونکہ کامیڈی کا مقصد انسانوں کو اس سے بدتر دکھانا ہے۔

تین عناصر یعنی ذرائع سے، ان اشیاء سے جن کو پیش کیا گیا ہے اور ان کے ادا کرنے کے طریقے سے، نقل کرنے والے فنون میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک ہومر اور سوفوکلیز دونوں چونکہ نیک لوگوں کو پیش کرتے ہیں اور دونوں انسانوں کو عمل کرتے ہوئے دکھاتے ہیں اس لیے دونوں نقال ہیں اور اسی باعث ان کی تصانیف کو ڈرامہ کہا جاتا ہے اور ڈوریا والے ان دونوں کو کامیڈی اور ٹریجڈی کا موجد قرار دیتے ہیں۔

چوتھے باب میں ارسطو نے شاعری کا مخرج اور اس کا ارتقا بیان کیا ہے۔ اس کے نزدیک شاعری کی تخلیق عام طور پر دو اسباب جو انسانی فطرت سے وابستہ ہیں کی بنا پر ہوتی ہے۔ نقل کرنے کی جبلت انسان میں ازل سے موجود ہے۔ وہ دوسری مخلوق سے اس لیے مختلف ہے کہ وہ ساری مخلوق میں سب سے زیادہ "نقال" ہے اور وہ اپنے ابتدائی سبق نقل ہی کے ذریعہ سیکھتے ہیں۔ پھر ہم سب میں نقل سے

وجود میں آئے ہوئے کاموں سے لطف اندوز ہونے کی جبلت بھی موجود ہے۔ کیونکہ ہم ان چیزوں کی صحیح نقل سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں جن کا دیکھنا ویسے ہمارے لیے تکلیف دہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم حاصل کرنا' صرف فلسفیوں ہی کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی' خواہ ان کی صلاحیتیں کتنی ہی محدود کیوں نہ ہوں' ایک بہت بڑی مسرت ہے۔ وہ ہم شکل اور مشابہ چیزیں دیکھ کر اس لیے لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ ایسا کرنے سے انہیں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

نقل کرنے کی جبلت ہمارے لیے اسی طرح فطری ہے جس طرح موسیقی اور وزن کا احساس اور بحریں بھی واضح طور پر وزن ہی کے الگ الگ ٹکڑے ہیں۔ ان فطری اور جبلی رجحانات سے شروع ہو کر اور اپنی ابتدائی کوششوں سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسان نے آخر کار اپنی جدت اور برجستگی سے شاعری ایجاد کر لی لیکن منفرد شاعروں کے مزاج کے لحاظ سے شاعری جلد ہی دو دھاروں میں تقسیم ہو گئی۔ زیادہ سنجیدہ شاعروں نے شائستہ اعمال اور اعلیٰ لوگوں کے کاموں کو پیش کیا جبکہ کم ذہن شاعروں نے ادنیٰ لوگوں کے بارے میں لکھا۔ اس طرح اول الذکر نے حمد اور قصیدے لکھے اور آخری الذکر نے "طنزیے" لکھے۔

ارسطو کے نزدیک ہومر جہاں سنجیدہ طرز میں سب سے بڑا شاعر تھا اور طرز کے کمال اور زندگی کو پیش کرنے کی ڈرامائی صفت میں یکتا تھا' وہاں مضحک چیزوں کو ڈرامائی عنصر عطا کر کے اس نے پہلی بار ایک ایسی راہ دکھائی جو کامیڈی نے اختیار کر لی۔ اس کی نظم "مارگائٹس" ہماری کامیڈیوں سے وہی رشتہ رکھتی ہے جو اس کی "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" ٹریجڈیوں سے رکھتی ہیں۔ جب ٹریجڈی اور کامیڈی وجود میں آگئیں تو جن لوگوں کا پیدائشی رجحان ایک قسم کی شاعری کی طرف تھا انہوں نے "طنزیہ" کے بجائے کامیڈیاں لکھیں اور جن کا رجحان دوسری طرف تھا انہوں نے "ایپک" کے بجائے ٹریجڈیاں لکھیں کیونکہ یہ دونوں نئی اصناف پچھلی اصناف کے مقابلہ میں زیادہ عظیم الشان اور زیادہ وقیع سمجھی گئیں۔

ابتدا میں ٹریجڈی اور کامیڈی دونوں طبع زاد تھیں۔ ایک کی ابتدا ان لوگوں سے ہوئی جو "ڈتھرامب" گاتے تھے اور دوسری کی ابتدا ان لوگوں سے ہوئی جو "فیلک" گیت گاتے تھے اور جو آج بھی ہمارے بہت سے شہروں میں ایک روایتی ادارہ کی طرح موجود ہیں۔ رفتہ رفتہ ٹریجڈی ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ بہت سی تبدیلیوں کے بعد اس نے ایک فطری شکل اختیار کرلی۔ اور جو مستقل ہوگئی۔ ایسکیلس پہلا شخص تھا جس نے ایکٹروں کی تعداد ایک کی بجائے دو کردی۔ کورس کا حصہ کم کردیا اور مکالمے کو اولیت عطا کی۔ سوفوکلیز نے تین ایکٹر پیش کیے اور منظر (سینری) کا اضافہ کیا۔ جہاں تک ٹریجڈی کی عظمت اور شکوہ کا تعلق ہے تو یہ صفت کافی عرصے کے بعد پیدا ہوئی، جبکہ "سیٹرک" ڈرامہ کے طریقوں سے آگے بڑھتے ہوئے ٹریجڈی نے ہلکے پلاٹ اور مضحک طرز کو ترک کردیا۔ اب اس کی بھی بحر" ٹرو کی ٹیٹرامیٹر" کے بجائے آئی امبک ہوگئی۔ پہلے شاعر ٹیٹرامیٹر اس لیے استعمال کرتے تھے کہ وہ سیٹرک شاعری کرتے تھے۔ جو رقص سے زیادہ قریب تھی لیکن جب مکالمہ استعمال میں آنے لگا تو اسی کے ساتھ قدرتی طور پر مناسب بحر بھی استعمال میں آنے لگی، کیونکہ آئی امبک بحر تمام بحروں میں سب سے زیادہ بات چیت سے قریب ہے۔ یہ اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کے دوران آئی امبک بحر میں جملے ادا کرنے لگتے ہیں، برخلاف اس کے ہم شاذ و نادر ہی ہیکسامیٹر میں بات کرتے ہیں اور یہ اسی وقت ہوتا ہی جب ہم بات چیت کے عام لہجے سے الگ ہوتے ہیں۔ ایک اور تبدیلی واقعات اور ایکٹ کی تعداد میں اضافہ تھا۔

بوطیقا کے پانچویں باب سے چوبیسویں باب تک کامیڈی، ایپک اور ٹریجڈی کی ابتدا، تعریف، پلاٹ، تنسیخ، انکشاف، مصیبت، ٹریجڈی کے حصے، خیال، زبان وبیان کی وضاحت کی گئی ہے۔ ارسطو کے نزدیک کامیڈی میں خراب قسم کے لوگ پیش کیے جاتے ہیں۔ کامیڈی کی ابتدائی تاریخ اخفا میں ہے اور یہ بھی معلوم نہیں

ہے کہ مصنوعی چہروں' پرولوگ' ایکٹروں کی تعداد اور اس قسم کی دوسری چیزوں کا اضافہ کس نے کیا۔ البتہ ان شاعروں کے آنے تک جنہوں نے اس میں کمال خاص کیا کامیڈی ایک مستقل ہیت اختیار کر چکی تھی۔ ایتھنز میں سب سے پہلے کریٹس نے اور سسلی میں اپیکارمس اور فورمس نے عام قسم کے پلاٹ اور حصوں کو اختیار کیا۔

ارسطو کے نزدیک ایپک شاعری ٹریجڈی سے اس طرح مماثل ہے کہ وہ بھی باوقار شاعری کے ذریعے سنجیدہ عمل پیش کرتی ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایپک ایک ہی بحر میں ہوتی ہے اور اس کی شکل افسانوی ہوتی ہے۔ ٹریجڈی' جہاں تک ممکن ہو' سورج کی ایک گردش کے واقعات کو سامنے لاتی ہے یا اس وقفے سے کچھ بڑھ جاتی ہے جبکہ ایپک میں عمل کے وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ان کے اجزاء میں سے کچھ ایسے ہیں جو دونوں قسموں میں مشترک ہیں اور کچھ محض ٹریجڈی ہی سے مخصوص ہیں۔ ایپک کے تمام عناصر ٹریجڈی میں ملتے ہیں جبکہ ٹریجڈی کی تمام چیزیں ایپک میں نہیں ملتیں۔

ارسطو کے خیال میں ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقل یا نمائندگی ہے جو سنجیدہ توجہ کے لائق ہو وہ اپنی جگہ مکمل بھی ہو اور کچھ وسعت بھی رکھتی ہو۔ ایسی زبان میں ہو جو فنی صنائع سے معمور ہو اور ڈرامے کے مختلف حصوں کے مناسب ہو۔ عمل کی شکل میں پیش کی گئی ہو' خوف اور ترس کے ذریعے جذبات کا تزکیہ بھی کرتی ہو۔ تماشہ ٹریجڈی کا لازمی حصہ ہے۔ ثانیاً" اس میں گیت اور طرز ادا کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہی نمائندگی کا ذریعہ ہے۔ ارسطو کے خیال میں ٹریجڈی میں عمل ہی کی نقل ہوتی ہے اور یہ عمل ان لوگوں سے وجود میں آتا ہے جو خیالات اور کردار کی منفرد صفات کا اظہار کرتے ہیں اور ان ہی کے ذریعہ ہم عمل کی صفات کا تعین کرتے ہیں۔ خیالات اور کردار عمل کے دو قدرتی اسباب ہیں اور ان ہی پر سب لوگوں کی کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے۔ عمل (Action) کی نقل ہی ٹریجڈی کا پلاٹ ہوتا ہے۔ اس کا کردار وہ ہے جو ہمیں "عمل میں حصہ لینے والوں" کی فطرت

کی تعریف کرنے میں مدد دیتا ہے اور خیال کا مطلب کسی بات کو ثابت کرنا یا کوئی رائے دینا ہے۔

ارسطو کے نزدیک ٹریجڈی کے چھ ضروری حصے ہوتے ہیں جو اس کی صفت کا تعین کرتے ہیں۔ یہ حصے، پلاٹ، کردار، زبان وبیان، خیال، تماشا اور گیت ہیں۔ ان میں سے دو ان ذرائع سے تعلق رکھتے ہیں جن سے عمل ادا کیا جاتا ہے، ایک ادائیگی کے ڈھنگ سے اور تین ادا ہونے والی اشیاء سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان عناصر میں سب سے اہم پلاٹ یعنی واقعات کی ترتیب ہے کیونکہ ٹریجڈی عمل اور زندگی، خوشی اور غم کی نقل ہے اور خوشی و غم، عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ زندگی کا مقصد ایک قسم کا عمل ہے اور عمل کے لیے کردار ضروری ہے۔ اس طرح واقعات اور پلاٹ ہی وہ مقصد ہیں جن سے ٹریجڈی کو سروکار ہے۔ کوئی ٹریجڈی عمل کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ "تنسیخ" اور "پہچان" (Reversal and Recognition) دراصل پلاٹ ہی کے حصے ہیں جو ٹریجڈی میں اہم مقام رکھتے ہیں اور جذبات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

پلاٹ ٹریجڈی کا پہلا اور بنیادی جزو ہے۔ اس کی حیثیت ٹریجڈی کی رگوں میں خون کی سی ہے۔ کردار کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ یہی بات مصوری کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ ٹریجڈی کی تیسری صفت "خیال" ہے۔ یہ ڈرامے کی تقریروں کا وہ جزو ہے جو فن سیاست اور خطیبانہ زبان سے تعلق رکھتا ہے جبکہ چوتھا مقام تقاریر کے زبان و بیان کا ہے۔ باقی عناصر میں موسیقی سب سے زیادہ اہم چیز ہے جو ڈرامہ میں تفریح بخش اضافے کا درجہ رکھتی ہے۔

ٹریجڈی ایک عمل کی نقل ہے جو مکمل و متحد ہوتی ہے اور ایک خاص وسعت رکھتی ہے۔ ایک مکمل اتحاد یا اکائی وہ ہے جس میں ابتدا، وسط اور خاتمہ ہو۔ "ابتدا" وہ ہے جو لازمی طور پر کسی دوسری چیز کے بعد نہیں آتی حالانکہ کوئی اور چیز بھی موجود ہوتی ہے یا اس کے بعد آتی ہے۔ برخلاف اس کے "خاتمہ" وہ

ہے جو ضروری یا عام نتیجہ کے طور پر کسی چیز کے بعد آتا ہے اور اس کے بعد کچھ اور نہیں آتا۔ "وسط" وہ ہے جو کسی چیز کے بعد آتا ہے اور اس کے بعد بھی کوئی چیز آتی ہے۔

ارسطو کے مطابق خوبصورتی اور حسن، وسعت اور ترتیب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ایک بہت ہی چھوٹی مخلوق اس لیے حسین نہیں ہوگی کیونکہ اسے دیکھ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اور اس کا تاثر جلد ہی بگڑ جائے گا۔ اسی طرح نہ کوئی بہت بڑی چیز ہی حسین ہوگی کیونکہ اس کو ایک نگاہ میں دیکھنا ممکن نہ ہوگا، اس لیے اس کے اتحاد اور وسعت کا اثر دیکھنے والے پر نہ پڑے گا لہٰذا ایک مناسب وسعت کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ نظر میں سما سکے۔ عمل کی مخصوص صفت کے لحاظ سے حد قائم ہونی چاہیے۔ اس طرح ایک قصہ جتنا لمبا ہوگا اتنا ہی خوبصورت ہوگا بشرطیکہ وہ غیر مبہم نہ ہو اور ضرورت کے مطابق اس میں اتنی تبدیلی لائی جاسکے کہ پریشانی سے خوشی اور خوشی سے پریشانی کا اظہار مناسب طریقہ سے ہوسکے۔ پلاٹ کو ایک مکمل وحدت کا مظہر ہونا چاہیے اس کے مختلف واقعات کی ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو ذرا ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے یا خارج کر دیا جائے تو وحدت کا اثر بری طرح خراب ہو جائے کیونکہ اگر کسی چیز کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس مکمل چیز کا اصلی اور ضروری حصہ نہیں ہے۔

ارسطو کے خیال میں شاعر کو شعر بنانے والے سے زیادہ پلاٹ کا بنانے والا ہونا چاہیے کیونکہ وہ اپنی نمائندگی یا نقل کی وجہ سے شاعر ہوتا ہے اور جس چیز کی وہ نمائندگی کرتا ہے وہ "عمل" ہوتا ہے اور اگر وہ ان چیزوں کے بارے میں لکھتا ہے، جو حقیقت میں ہو چکی ہیں، تو اس بات سے وہ کم درجہ کا شاعر نہیں ہو جاتا، کیونکہ جو چیزیں ہو چکی ہیں ان کو امکان اور قیاس کے قانون کے مطابق لانے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اس لیے وہ ان کی بابت لکھتے ہوئے بھی شاعر ہی رہے گا۔ سادے پلاٹ

اور "عمل" میں سب سے خراب وہ ہوتے ہیں جو قصہ در قصہ چلتے ہیں۔ اس کے نزدیک ٹریجڈی صرف ایک مکمل عمل ہی کی نمائندگی (نقل) نہیں ہے بلکہ ایسے واقعات کی بھی نقل ہے جو خوف اور ترس کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ یہ اثر اس وقت اور گہرا ہو جاتا ہے جب واقعات غیر متوقع طور پر منطقی تسلسل کے ساتھ پیش کیے گئے ہوں کیونکہ میکانکی یا اتفاقی طریقے پر پیش کرنے کے مقابلے میں اس طور پر وہ زیادہ قابل توجہ ہوں گے۔

ارسطو کے خیال میں کچھ پلاٹ سادہ اور کچھ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اس کا ظاہری سبب یہ ہے کہ وہ عمل (Action) جن کا یہ اظہار کرتے ہیں' ایک قسم یا دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ سادہ عمل وہ ہے جس میں قسمت کی تبدیلی بغیر کسی الٹ پھیر یا انکشاف کے پیدا ہو۔ پیچیدہ عمل وہ ہے جس میں تبدیلی' تنسیخ یا انکشاف یا دونوں ذریعہ سے وجود میں آئی ہو۔ ان چیزوں کا ارتقا پلاٹ کی ترتیب کے ساتھ اس حد تک ہونا چاہیے کہ وہ ان واقعات کا' جو گزر چکے ہیں' یقینی اور قرین قیاس نتیجہ معلوم ہوں کیونکہ اس چیز میں' جو کسی چیز کے نتیجے کے طور پر ظہور میں آتی ہے اور اس چیز میں' جو اس کے بعد ظہور میں آتی ہے' بڑا فرق ہے۔

اس کے نزدیک "تنسیخ" ایک حالت سے بالکل ایسی متضاد حالت میں تبدیل ہو جانے کا نام ہے جو قیاس اور ضرورت کے مطابق ہو۔ جبکہ انکشاف ناواقفیت سے واقفیت میں تبدیل ہو جانے کا نام ہے اور اس کی موثر ترین شکل وہ ہے جو تنسیخ کے ساتھ وجود میں آئے۔ کیونکہ ایسا انکشاف جو تنسیخ کے ساتھ ہوا ہو اپنے اندر خوف یا ترس کے جذبات رکھتا ہے اور یہی وہ عوامل ہیں جن کے باعث اتحاد اور میل سے اچھے یا برے خاتمے تک پہنچنا ممکن ہے' تیسرا عنصر مصیبت یا دکھ کا عمل ہے۔

ارسطو کے نزدیک پرولوگ' اپی سوڈ' ایکسوڈ' اور کورس گیت وغیرہ ٹریجڈی کے خاص حصے ہیں آخر الذکر کے دو حصے ہیں۔ پیروڈ اور اسٹاسیمون' یہ سب

ٹریجڈیوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ ایکٹروں کے گیت اور "کومائے" صرف کچھ ہی ٹریجڈیوں کی خصوصیت ہیں۔

پرولوگ ٹریجڈی کے اس حصہ کا مکمل جزو ہے جو پیروڈیا کورس سے پہلے آتا ہے۔ ایپی سوڈ ایک ٹریجڈی کے اس حصہ کا مکمل جزو ہے جو مکمل کورس گیت کے درمیان آتا ہے۔ ایکسوڈ ایک ٹریجڈی کے اس حصے کا مکمل جزو ہے جس کے بعد کوئی کورس گیت نہیں آتا۔ کورس کے حصے میں پیروڈ کورس سے پہلے کی مکمل تقریر کو کہتے ہیں اور اسٹاسیمون وہ کورس گیت ہے جسے گانے والے (کورس) بغیر بحروں کے التزام کے گاتے ہیں۔ "کوموس" ایک ایسے نوحے کو کہتے ہیں جس میں کورس اور ایکٹر دونوں حصہ لیتے ہیں۔

اس کے نزدیک بہترین "ٹریجڈی کا ڈھانچا پیچیدہ ہونا چاہیے اور اس میں ایسے عوامل پیش کیے جانے چاہئیں جو خوف اور ترس کے جذبات کو ابھاریں' ایک اچھی طرح سوچے سمجھے ہوئے پلاٹ میں "واحد" دلچسپی ہونی چاہیے' دوہری دلچسپی نہیں۔ اس پلاٹ میں قسمت کی تبدیلی پریشانی سے خوشحالی کی طرف نہیں بلکہ متضاد سمت میں ہوگی یعنی خوشحالی سے پریشانی کی طرف اور یہ عمل بدکاری کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی بڑی غلطی کی وجہ سے ہوگا۔

ارسطو کے خیال میں خوف اور ترس کے جذبات کو تماشے کے ذریعے ابھارا جاسکتا ہے لیکن یہ جذبات عمل کی تعمیر سے بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ یہ زیادہ بہتر طریقہ اور بہتر ڈرامہ نگار شاعر کی نمایاں صفت ہے۔ کیونکہ پلاٹ کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے کہ اسے بغیر اسٹیج پر دیکھتے ہوئے بھی' محض سن کر' کوئی شخص صرف واقعات کی بنا پر' خوف اور ترس کے عالم میں آجائے۔ اسٹیج کے تماشے سے یہ اثر پیدا کرنا کم درجہ کا فن ہے اور اس اثر کو پیدا کرنے کے لیے پروڈیوسر کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ لوگ جو تماشے کے ذریعے خوف کا اثر نہیں بلکہ غیر معمولی چیز دکھانا چاہتے ہیں ان کو ٹریجڈی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا' کیونکہ ٹریجڈی سے ہر قسم کی

دلچسپی کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا اور کیونکہ ڈرامہ نگار شاعر اپنی نقل یا نمائندگی کے ذریعہ ایسی المیہ دلچسپی پیدا کرتا ہے جو خوف اور ترس سے تعلق رکھتی ہے' اس لیے یہ بات واضح ہے کہ یہ اثر پلاٹ کے واقعات ہی سے وابستہ ہے۔ ہماری ٹریجڈیاں چند خاندانوں سے مخصوص ہیں کیونکہ ڈرامائی مواد کی تلاش میں' کسی علم کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اتفاقی طور سے' شاعروں پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے پلاٹوں میں المیہ اثر کیسے قائم کریں؟ اور اسی لیے وہ ان خاندانوں کے حالات حاصل کرنے پر مجبور ہیں جو اسی قسم کے مصائب و ابتلا سے گزرے۔

ارسطو کے نزدیک کردار نگاری میں چار چیزوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ اول کردار کو نیک ہونا چاہیے۔ دوم کردار کی عکاسی موزوں اور موقع محل کے مطابق ہونی چاہیے۔ سوم کرداروں کو زندگی کے مطابق ہونا چاہیے اور چہارم کرداروں کو مربوط اور ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ کردار نگاری میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ بات ضروری اور قرین قیاس ہو۔ پھر پلاٹ کا انکشاف خود پلاٹ کے حالات و واقعات سے ہو اور یہ انکشاف میکانکی طریقہ پر نہ ہو۔ جو کچھ دکھایا جائے اس کے بارے میں کوئی چیز مبہم نہ رہے اور اگر ایسی چیز ہے تو اسے ٹریجڈی سے الگ رکھا جائے۔

ٹریجڈی ایسے لوگوں کی "نقل" ہے جو اوسط درجے کے لوگوں سے بلند تر ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں شبیہ بنانے والے اچھے مصوروں کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہ لوگ جب اپنے ماڈلوں کی امتیازی صفات دکھاتے ہیں تو وہ انہیں اس سے کہیں زیادہ بہتر طور پر پیش کرتے ہیں جیسی کہ وہ اصل میں ہیں۔ اسی طرح شاعر کو ایسے لوگوں کی تصویر کشی میں' جو بددماغ ہیں یا بلغمی مزاج رکھتے ہیں اور جن میں کردار کے اور دوسرے نقائص بھی ہیں' یہ سب صفات واضح کر دینی چاہئیں اور اسی کے ساتھ ساتھ انہیں نفیس لوگوں کی طرح پیش بھی کرنا چاہیے۔

ارسطو کے نزدیک انکشاف کی مختلف قسموں میں پہلی قسم سب سے کم فنکارانہ ہے اور زیادہ تر تخلیقی قوت کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں نشانیوں اور

اشاروں سے انکشاف کیا جاتا ہے۔ یہ قدرتی نشان ہو سکتے ہیں یا پھر وہ نشان جو بنائے گئے ہوں۔ دوسری قسم کے انکشافات وہ ہیں جنہیں خود شاعر گھڑتا ہے اور جو اسی وجہ سے غیر فنکارانہ ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کا انکشاف حافظے کے ذریعے اس وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز دیکھ کر اصل واقع یا بات یاد آجاتی ہے۔ چوتھی قسم عقل ودلیل کا نتیجہ ہوتی ہے اور ایک چھوٹا اور فرضی قسم کا انکشاف بھی ہے جو مختلف لوگوں کی غلط بحث سے پیدا ہوتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک ان تمام قسم کے انکشافات میں سب سے بہتر انکشاف وہ ہے جو واقعات سے ہو رمیں آئے اور یہ انکشاف قرین قیاس واقعات کا نتیجہ ہو۔

ارسطو کے خیال میں پلاٹ کو بنانے اور اس قسم کے تقریریں سیکھنے میں جو اس کے مناسب حال ہو شاعر کو جہاں تک ممکن ہو سین کو نظر کے سامنے رکھنا چاہیے جیسے وہ خود ان تمام واقعات کا عینی شاہد ہو۔ جہاں تک ممکن ہو ڈرامائی شاعر جب تقریر لکھے تو لکھتے وقت خود مناسب اشارے ساتھ ساتھ کرتا جائے کیونکہ برابر کی صلاحیت رکھنے والے مصنفین میں وہ مصنف زیادہ پراثر ہوگا جو خود جذبات کو محسوس بھی کرتا ہے پریشانی اور غصہ کی کیفیت وہی مصنف زیادہ اچھے طریقے پر پیش کرسکے گا جو خود اس عالم میں ہو۔ اسی باعث شاعری یا تو زبردست فطری صلاحیت رکھنے والے آدمی کا کام ہے یا ایسے شخص کا جو پورے طور سے صحیح الدماغ نہ ہو۔ اول الذکر بہت زیادہ حساس ہوتا ہے اور آخر الذکر عالم جذب میں ہوتا ہے۔ قصوں کے سلسلے میں چاہے وہ بنے بنائے ہوں یا اس نے خود بنائے ہوں شاعر کو پہلے ان کا خاکہ بنالینا چاہیے اور پھر ان میں مناسب قصوں اور واقعات کا اضافہ کرنا چاہیے۔ جب شاعر اس منزل پر پہنچے تو اسے اپنے کرداروں کو نام دے دینے چاہئیں اور قصوں اور واقعات کا اضافہ کر دینا چاہیے۔ ڈراموں میں واقعات مختصر اور ایک شاعری

میں تفصیل کے ساتھ آتے ہیں۔

ارسطو کے نزدیک ہر ٹریجڈی کی اپنی پیچیدگی اور اپنا انجام ہوتا ہے۔ پیچیدگی ان واقعات سے پیدا ہوتی ہے جو پلاٹ سے باہر ہوتے ہیں اور اکثر ان سے بھی جو پلاٹ کے اندر ہوتے ہیں اور باقی ان پیچیدگیوں کا حل ہے جسے انجام کہا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں پیچیدگی کا مطلب قصہ کا وہ حصہ ہے جو آغاز سے اس مقام تک آئے جہاں سے قسمت اچھی یا بری ہو جاتی ہے۔ انجام کا مطلب وہ حصہ ہے جو قسمت کی اس تبدیلی سے لے کر آخر تک ہوتا ہے لہٰذا ٹریجڈی کی درجہ بندی ایک دوسرے سے مناسب یا مختلف پلاٹوں کے حساب سے کی جانی چاہیے۔

ارسطو کے نزدیک ٹریجڈی کی چار قسمیں ہیں' ایک ٹریجڈی پیچیدہ ہوتی ہے جو تنسیخ اور انکشاف پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسری دکھ تکلیف اور مصائب کی ٹریجڈی ہے۔ تیسری کردار کی ٹریجڈی ہے اور چوتھی قابل تماشہ ٹریجڈی ہے۔ شاعر کو چاہیے کہ وہ ان تمام عناصر کو شامل کرے یا پھر بصورت دیگر اہم ترین عنصر میں سے جس قدر ممکن ہوں شامل کر لینے چاہیں۔ ڈرامائی شاعر کو چاہیے کہ اپنی ٹریجڈی کو ایپک کی شکل نہ دے۔ کورس کو بھی ایکٹر بنا کر ہی اس طرح پیش کرنا چاہیے جیسے وہ بھی کل کا ایک جزو ہو اور عمل میں شریک ہو۔ یہ کورس محض ڈرامے کے درمیانی وقفہ میں ہوسکتے ہیں۔

ارسطو کے نزدیک خیال میں وہ سب اثرات شامل ہیں جو زبان سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں دلائل اور ان کا رد' ترس' خوف' غصہ اور اسی قسم کے جذبات کو بیدار کرنا اور مبالغہ اور تحقیر شامل ہیں۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے اس کے مطالعہ کی ایک شاخ اظہار کی مختلف ہیئتیں ہیں جن کو سمجھنا فن تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعر کے فن پر سنجیدہ تنقید ان چیزوں سے اس کی واقفیت یا عدم واقفیت کے مطابق نہیں کی جاسکتی۔

زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پامال و عامیانہ ہوئے بغیر قابل فہم

ہو۔ سب سے زیادہ قابل فہم زبان و بیان وہ ہے جس میں روزمرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہوں مگر یہ پامال و عامیانہ ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے وہ زبان جو غیرمانوس الفاظ و تراکیب استعمال کرتی ہے شان و دبدبہ کی حامل ہو کر عام سطح سے بلند ہو جاتی ہے۔ معمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقائق کو زبان کی ناممکن صورتوں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ یہ عام الفاظ کے ذریعے سے نہیں کیا جاسکتا لیکن استعاروں کے استعمال سے ہوسکتا ہے۔ اسی طرح غیرمانوس الفاظ کی درآمد ظلم و تشدد کے مترادف ہے۔ کرنا یہ چاہیے کہ ان مختلف عناصر کا امتزاج پیدا کیاجائے کیونکہ ایک عنصر زبان کو پست اور عامیانہ ہونے سے بچائے گا جبکہ روزمرہ کے الفاظ ضروری صفائی پیدا کریں گے۔ زبان و بیان کی صفائی اور شان و وقار پیدا کرنے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ تشریحی الفاظ' ایجاز و اختصار والے الفاظ اور الفاظ کی بدلی ہوئی شکلیں استعمال کی جائیں۔

ارسطو کے خیال میں یہ بہت مناسب بات ہے کہ ہر صنعت کا مناسب استعمال کیاجائے مگر سب سے اہم بات استعارے کا استعمال ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی سے سیکھی نہیں جاسکتی اور اسی سے فطری صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ استعاری کے استعمال کی قابلیت مماثلتوں کے ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔

ارسطو کے نزدیک افسانوی نظم میں پلاٹ ڈرامائی طریقے پر تعمیر کیے جانے چاہیں جیسے ٹریجڈی کے ہوتے ہیں۔ وہ صرف ایک "عمل" پر مبنی ہونے چاہیں' جو متحد اور مکمل ہو اور جس میں آغاز' وسط اور انجام بھی ہو' تاکہ ایک مکمل زندہ چیز کی طرح نظم اپنا مخصوص اثر پیدا کرسکے۔ ایپک نظموں کی تعمیر عام تاریخوں کی طرح بھی نہیں ہونی چاہیے جن میں صرف ایک عمل کا انکشاف نہیں ہوتا بلکہ ایک دور کو پیش کیا جاتا ہے اور اس دور میں بھی جو کچھ ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص پر گزرا' خواہ وہ واقعات ایک دوسرے سے کتنے ہی غیر متعلق کیوں نہ ہوں جیسے سالاسس کی بحری جنگ اور سسلی میں کارتھیجن کی جنگ ایک ہی وقت میں ہوئیں

لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی نہیں تھا۔ اسی طرح وقت کے تسلسل میں واقعات یکے بعد دیگرے آئیں مگر ان کے نتائج ایک نہ ہوں۔ مگر ہمارے بہت سے شاعر تاریخ نویس کا طریقہ کار استعمال کرتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی ہومر وہ شاعر ہے جو تمام شاعروں سے زیادہ الہامی اثر رکھتا ہے۔ حالانکہ جنگ ٹروجن میں آغاز اور انجام دونوں ہیں لیکن اس نے پوری جنگ کو نظم میں شامل نہیں کیا کیونکہ یہ متحد اور مکمل اثر کے تعلق سے بہت بڑا موضوع ہوتا اور اگر وہ اس کی لمبائی کم کر دیتا تو اس کے واقعات کا تنوع اسے بہت پیچیدہ بنا دیتا اس لیے اس نے قصہ کا ایک حصہ منتخب کیا اور دوسرے حصے سے بہت سے واقعات اس میں شامل کر دیے۔ دوسرے ایپک شاعر ایک ہی آدمی یا ایک ہی دور یا ایک ہی عمل کے بارے میں لکھتے ہیں جس کی تعمیر وہ مختلف واقعات کی مدد سے کرتے ہیں۔ اس قسم کے شاعروں میں "سپریا" اور "دی لٹل ایلیڈ" کے مصنفوں کے نام لیے جاسکتے ہیں جبکہ "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" سے صرف ایک ہی ٹریجڈی بنائی جاسکتی تھی۔ "سپریا" سے کئی ٹریجڈیاں بنائی جاسکتی ہیں اور "دی لٹل ایلیڈ" سے آٹھ سے بھی زیادہ ایوارڈ اوف دی آرمس، فیلوس بیٹس، نیوپ ٹولیمس، یوری فیلس، اوڈی سیئس دی بیگر، لاکو نیئن دی مین، سیک اوف ٹرائی، دی پارچر اوف دی فلیٹ۔ ان کے علاوہ سینون اور ٹروجن دی مین۔

ارسطو کے نزدیک ایپک شاعری کی بھی وہی قسمیں ہیں جو ٹریجڈی کی ہیں یعنی سادہ، پیچیدہ، وہ جو کرداروں سے سروکار رکھتی ہے اور وہ جو مصائب و ابتلا کو موضوع بناتی ہے۔ گیت اور تماشے کو چھوڑ کر اس کے بھی وہی حصے ہوتے ہیں جو ٹریجڈی کے ہوتے ہیں۔ اس میں بھی ٹریجڈی کی طرح انکشاف، تنسیخ اور المیہ واقعات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ خیالات اور زبان و بیان بھی اعلیٰ معیار کے ہونے چاہئیں۔ ہومر نے ان سب چیزوں کو پہلی بار استعمال کیا اور انہیں نہایت چابکدستی سے استعمال کیا۔ اس دور کی نظموں میں سے ایک یعنی "ایلیڈ"

تعمیر کے اعتبار سے سادہ ہے اور مصائب کا قصہ پیش کرتی ہے۔ دوسری نظم یعنی "اوڈیسی" پیچیدہ ہے اور کردار پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں نظمیں خیالات اور زبان و بیان کے اعتبار سے تمام نظموں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ ایپک' ٹریجڈی سے نفس مضمون کی لمبائی اور بحر کے استعمال میں بھی مختلف ہے۔ جہاں تک لمبائی کا تعلق ہے وہ اتنی کافی ہے جس میں ابتدا اور انجام ایک نظر میں یکجا نظر آسکیں۔ اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب نظمیں قدیم زمانے کی ایپک نظموں کے مقابلے میں مختصر ہوں مگر ان ٹریجڈیوں کے برابر ہوں جنہیں ایک ساتھ ایک نشست میں پیش کیا جاتا ہے۔ ایپک کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ وہ خاصی طویل ہوسکتی ہے۔ ٹریجڈی میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک قصے کے بہت سے حصے ایک ہی وقت میں دکھائے جاسکیں' صرف اتنا ہی حصہ دکھایا جاسکتا ہے جسے ایکٹر اسٹیج پر پیش کر رہے ہیں۔ برخلاف اس کے ایپک شاعری چونکہ افسانوی ہوتی ہے اس لیے بہت سے واقعات جو ایک ہی وقت میں گزرے ہیں' پیش کرسکتی ہے اور' اگر وہ باربط ہوں تو ان سے نظم کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس میں وقار' عظمت' تنوع اور اس کے قصوں میں رنگا رنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ یک رنگی اسٹیج پر ٹریجڈی کے اثر کو خراب کر دیتی ہے اور ناظرین کو بور کر دیتی ہے۔

ارسطو کے خیال میں ہیکسامیٹر ایپک کے لیے موزوں بحر ہے۔ اگر کسی کو افسانوی نظم کسی دوسری بحر میں یا مختلف بحروں میں لکھنی پڑے تو وہ انمل بے جوڑ ہوجائے گی' کیونکہ تمام بحروں میں ہیکسامیٹر ہی وہ بحر ہے جو سب سے زیادہ وقیع اور مستحکم ہے اور جس میں غیر ملکی تراکیب' الفاظ اور استعاروں کو اپنانے کی بڑی صلاحیت ہے۔ اس لحاظ سے بھی نقل کی افسانوی شکل دوسری تمام شکلوں سے بہتر ہے۔ "آئی امبک" اور "ٹروکاک ٹیٹرامیٹر" وہ اوزان ہیں جو حرکت کے اظہار کے لیے موزوں ہیں۔ آخر الذکر رقص کا وزن ہے اور اول الذکر عمل کی ڈرامائی نقل کے لیے موزوں ہے۔ بہرحال کئی اوزان کو ایک ساتھ ملانا' جیسا کہ شائریمون نے

کیا' مناسب نہیں ہے۔ اور اسی لیے کسی نے بھی طویل نظم اس بحر کے علاوہ نہیں لکھی۔ ویسے یہ بات کہ کسی مقصد کے لیے کون سی بحر استعمال کرنی چاہیے' قدرت ہی سکھا سکتی ہے۔

ارسطو کے نزدیک ہومر جہاں کئی اعتبار سے قابل تعریف ہے وہاں ان معنی میں بھی قابل تعریف ہے کہ وہی ایک شاعر ہے جو اس بات کو سمجھتا ہے کہ خود شاعر کو اپنی نظم میں کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ اپنی نظم میں خود شاعر کو جتنا کم ممکن ہو بولنا چاہیے کیونکہ اس طرح وہ عمل کی نقل نہیں کرتا۔ دوسرے شاعر اپنی ساری نظم میں خود بولتے رہتے ہیں اور ان کی تصنیف کا بہت کم حصہ غیر ذاتی ہوتا ہے لیکن ہومر چند تمہیدی الفاظ کے بعد فوراً ہی ایک آدمی یا ایک عورت یا کسی دوسرے شخص کو سامنے لے آتا ہے جس کا اپنا کردار ہوتا ہے اور جس کی اپنی نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں۔

ارسطو کے مطابق ٹریجڈی میں مافوق العادات چیزوں کا ذکر ضرور ہونا چاہیے لیکن ایپک شاعری میں' جس میں کام کرنے والے لوگ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتے' ناقابل توجیہہ چیزوں کو زیادہ شامل کیا جائے کیونکہ مافوق الفطرت امور انہی سے تشکیل پاتے ہیں۔ مافوق الفطرت امور مسرت کا ذریعہ ہوتے ہیں جیسا کہ' اسی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو خبر مشہور ہوتی ہے اس میں سب لوگ اپنی تفریح کا سامان شامل کر دیتے ہیں۔

ارسطو کے خیال میں دوسرے شاعروں کو یہ بات بھی ہومر نے سکھائی ہے کہ غلط اور فرضی باتیں کس طرح ہوشیاری اور سلیقے سے بیان کی جائیں یعنی حسن تعلیل اور مغالطے کے استعمال سے۔ اگر ایک چیز موجود ہے کیونکہ دوسری موجود ہے یا ایک واقعہ ہوا ہے کیونکہ دوسرا بھی ہوا ہے تو لوگ سوچتے ہیں کہ اگر نتیجہ موجود ہے یا واقعہ ہوا ہے تو جس چیز کا وہ نتیجہ ہے وہ بھی ضرور موجود ہوگی لیکن بات یہ نہیں ہے لہٰذا اگر ایک دعویٰ غلط تھا لیکن اس کے علاوہ کچھ تھا جو صحیح تھا یا

جسے صحیح ہونا چاہیے اگر دعویٰ صحیح تھا' تو یہی کچھ اور ہمیں ایک حقیقت کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ذہن اس کو صحیح مانتے ہوئے مغالطے سے اور یجنل دعوے کی سچائی کو قبول کر لے۔ قرین قیاس ناممکنات کو دور از قیاس ممکنات پر ترجیح دینا چاہیے۔ قصہ غیر عقلی واقعات پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ غیر عقلی چیزوں کو جہاں تک ممکن ہو خارج کر دینا چاہیے اور اگر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے تو انہیں خاص قصے سے الگ رکھا جائے۔ زبان کی خوبیاں اس حصے میں پیدا کی جائیں جہاں کردار یا خیال اہم نہ ہو' کیونکہ بہت زیادہ رنگین زبان' خیالات اور کردار کے اظہار میں حائل ہو گی۔

بوطیقا کا پچیسواں باب تنقیدی اعتراضات اور ان کے جواب پر مشتمل ہے۔ ارسطو کے نزدیک پانچ اعتراضات ایسے ہیں جن سے کسی عبارت پر نکتہ چینی کی جا سکتی ہے یعنی وہ غیر ممکن ہے' خلاف عقل ہے' غیر اخلاقی ہے' بے ربط ہے اور فنی طور پر غلط ہے جس کا جواب ان درج ذیل بارہ اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر شاعر نے کوئی ناممکن بات پیش کی ہے تو اس نے غلطی ضرور کی ہے لیکن وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہے۔ اگر یہ غلطی نظم کے کسی حصے کو زیادہ پر زور بنا رہی ہے۔ اگر یہ مقصد فن کی ضروریات سے مطابقت رکھتے ہوئے بھی حاصل ہو سکتا تھا تو پھر غلطی کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا' کیونکہ ایک نظم کو جہاں تک ممکن ہو نقائص سے بری ہونا چاہیے پھر یہ سوال کہ دونوں اقسام کی غلطیوں میں سے کون سے غلطی کی گئی ہے؟ آیا وہ غلطی جو فن شاعری کی اصل سے تعلق رکھتی ہے یا وہ صرف اتفاقی ہے۔ یہ ایک کم درجہ کی غلطی ہے۔ اگر شاعر کو اس بات کا علم نہ ہو کہ مادہ ہرن کے سینگ نہیں ہوتے بمقابلہ اس کے وہ ہرن کی ایسی تصویر پیش کرے جسے پہچانا نہ جا سکے۔

دوسرے اعتراض یعنی "وہ صحیح نہیں ہے" کا جواب یہ ہو سکتا ہے "نہیں' لیکن اس کو ایسا ہی ہونا چاہیے" جیسا کہ سوفوکلیز نے کہا تھا کہ وہ ایسے انسانوں کی

تصویر پیش کرتا ہے جیسا انہیں ہونا چاہیے جب کہ یوری پیڈیس نے انہیں اس طرح پیش کیا جیسا کہ وہ ہیں۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی مناسب نہ سمجھی جائے تو پھر ایسی صورت میں "روایت" سے سند لینی چاہیے جیسا کہ دیوتاؤں کے قصوں کے بارے میں ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ قصے نہ تو سچے ہوں اور نہ سچائی میں اضافہ کرتے ہوں لیکن جیسا کہ زنوفیز نے کہا ہے کہ پھر بھی وہ روایت کے مطابق ہوتے ہیں۔ دوسرے معاملات میں جواب یہ ہوسکتا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ سچائی سے بہتر ہیں' بلکہ یہ اشیاء کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسا کہ وہ پہلے زمانے میں پیش کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر نیزوں کے بارے میں کہا جائے "کہ ان کے نیزے نوکوں پر بالکل سیدھے کھڑے تھے" کیونکہ اس زمانہ میں یہی رواج تھا اور اب بھی الریا کے لوگوں میں یہی رواج ہے۔

تیسرے اعتراض یعنی وہ بات جو کہی گئی ہے یا ہوئی ہے آیا اخلاقی طور پر اچھی ہے یا بُری' ہمیں اس بات یا کام کی اچھائی یا بُرائی ہی کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ یہ بات کس نے کہی اور کن سے کہی؟ یہ کام کس نے کیا اور کن لوگوں کے لیے کیا؟ اس کا موقع' ذریعہ اور سبب کیا تھا؟ مثلاً کیا یہ بات یا کام کسی بڑی بھلائی کے لیے کیا گیا یا کسی بڑی برائی کو دور کرنے کے لیے کیا گیا؟

چوتھے اعتراض کے حوالہ سے عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ "ناممکن" کا جواز شاعرانہ اثر کے اعتبار سے یا حقیقت کو بہتر بنانے کی کوشش کے تعلق سے یا مسلمہ روایت کے حوالے سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک شاعرانہ اثر کا تعلق ہے ایک تشفی بخش ناممکن بات کو ایک غیر تشفی بخش ممکن بات پر ترجیح دینی چاہیے۔ حالانکہ یہ ناممکن ہے کہ ایسے لوگ موجود ہوں جیسا کہ زیوکس نے پیش کیے ہیں لیکن یہ بہتر ہوتا اگر اس قسم کے لوگ موجود ہوتے کیونکہ مثالی قسم کے لوگوں کو انتہائی اچھا ہونا چاہیے۔

ارسطو کے نزدیک مسلمہ روایت غیر عقلی انداز کا جواز ہو سکتی ہے جیسے یہ کہنا کہ ایسا دور بھی ہوتا ہے جب یہ چیزیں خلاف عقل نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ قرین قیاس ہے کہ بہت سی باتیں قیاس کے خلاف ہوں۔ زبان کی غلطیوں کا مطالعہ بھی اسی طرح کیا جائے جیسے منطق کی رد کرنے والی دلیلوں کا، تاکہ یہ دیکھا جائے کہ شاعر کا بھی وہی مطلب ہے جو تمہارا ہے قبل اس کے کہ اس پر الزام لگایا جائے۔

ارسطو کا انداز تحریر ذرا مشکل اور خاصہ ماہرانہ ہے۔ باہم متناقص اور متضاد حوالہ جات سے معاملات الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک ہی بات میں انکار و اقرار کی کیفیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ تشبیہات سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے۔ انداز تحریر استقراری اور جدلیاتی ہے۔ وہ خیالات کی گہرائی تک رسائی کے لیے منطق سے رسائی حاصل کرتا ہے۔

آیئے ایونکس مکتبہ فکر سے افلاطون تک کے مادی، طبعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی فلسفے کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے فلسفہ ارسطو کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن اس سے پیشتر قاری کی سہولت کے لیے مادہ، مادیت، مابعد الطبیعیات اور عینیت پرستی کی تعریف کرنا نہایت مناسب ہوگا۔ مادہ ایک ایسا فلسفیانہ مقولہ ہے جو یہ نشاندہی کرتا ہے کہ معروضی حقیقت شعور سے عدم انحصار میں وجود رکھتی ہے اور اس میں منعکس ہوتی ہے مادیت ایک ایسا نظریہ ہے جس کی رو سے فطرت کی ہر چیز میں زندگی اور احساس کی صلاحیت موجود ہے۔ مابعد الطبیعیات تفکر کے خلاف ایک سائنسی طریقہ ہے جو جدلیات کی ضد ہے۔ اس فلسفہ میں مظاہر کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ سکون کی حالت میں دیکھا جاتا ہے جبکہ عینیت پرستی خاص فلسفیانہ رجحانوں میں سے ایک ہے جو فلسفہ کے بنیادی سوال کے حل میں مادیت پسندی کی ضد ہے۔ عینیت پرستی کی دو قسمیں داخلی اور معروضی ہیں۔ معروضی عینیت پرستی اصول اول کے طور پر ذاتی روح جبکہ داخلی عینیت پرستی فرد کے شعور کو اولین سمجھتی ہے۔

# ارسطو کا مادی و طبیعیاتی فلسفہ

ایونکس مکتبہ فکر (Inoics School) کے بانی طالیس (Thales) (624–556 ق م) جس کا شمار دنیا کے سات عظیم داناؤں میں ہوتا ہے نے اپنے فلسفہ میں کہا کہ "تمام مادی اشیاء کی بنیاد پانی ہے اور یہ کہ زمین ایک تھالی کی مانند ہے جو پانی پر تیر رہی ہے۔"

پھر اسی فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے اسی مکتبہ فکر کے دوسرے فلاسفر اناکسی مینڈر (Aanaxi Mander) (611–547 ق م) نے اپنے فلسفہ میں کہا کہ "مادہ بے صورت، غیر متعین اور لامحدود صورت میں خلا میں پھیلا ہوا تھا۔ پہلے ایک دنیا وجود میں آئی پھر اس کا ارتقاء ہوا اور آخر فنا ہو گئی اور پھر ایک اور نئی دنیا منصہ شہود پر آئی اور مٹ گئی اور یہ سلسلہ یونہی چلتا آ رہا ہے۔ مادہ کی دو صورتیں ہیں گرم اور ٹھنڈا۔ ٹھنڈا مادہ مرطوب ہے اور یہ ٹھنڈا اور نم دار مادہ آخر کار زمین کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اس کائنات کے مرکز میں واقع ہے جبکہ مادے کا گرم حصہ زمین کے گرد ایک دائرے کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ یہ زمین بھی جو کائنات کے مرکز میں ہے اس مادے کے ٹھنڈے حصے سے وجود میں آئی ہے۔ جو ٹھوس ہونے سے پہلے مائع شکل میں تھا اور زمین کے گرد دائرے کی شکل میں موجود تھا۔ مادے کی

گرمی نے زمین کے پانی کو تیزی سے بخارات میں تبدیل کیا اور یہ ہوا یا بخارات گرمی کے باعث پھیل کر اوپر اٹھے اور انہوں نے زمین کے گرد پھیلی گرم مادے کی تہہ کو توڑ دیا اور یہ مادہ لکڑی کے برادے جیسے گول گول لیکن بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت میں تبدیل ہو گیا جن کی شکل گول گول پہیوں جیسی تھی جنہوں نے ساری زمین کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ برادے کے ان گول ڈھیروں کو ایک خاص قسم کے ٹھوس مادے نے کچھ اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ ان کے اندر چھپی ہوئی آگ ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔ سلنڈر کی طرح لمبوتری یہ زمین ابتدا میں مادہ کی مائع صورت میں وجود میں آئی اور جب یہ مادہ بخارات کے باعث آہستہ آہستہ جمنا شروع ہوا تو اس مرحلے کے دوران جاندار چیزوں نے زمین کے مادے کی نمی اور گرمی سے جنم لینا شروع کیا۔ شروع شروع میں ان جاندار چیزوں کی نوع بہت معمولی درجے کی تھی پھر آہستہ آہستہ ان جانداروں نے اپنی ساخت کو بہتر اعضا مہیا کرنے کے لیے بہت سے ارتقائی مراحل طے کئے اور اس کام کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اپنے بیرونی ماحول کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا۔ پانی میں رہنے والی مچھلی انسانی جنس کی ابتدائی نوع تھی۔"

اسی مکتبہ فکر کے ایک اور فلاسفر اناکسی مینیز (Anaaxi Menes) (588-524 ق م) نے کہا کہ "کائنات اور مادی دنیا کا بنیادی اصول ہوا ہے۔ یہ ہوا غیر متعین مادے کی طرح خلا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہوا مسلسل حرکت میں ہے اور حرکت کا یہ اصول ہوا کی بنیادی فطرت میں موجود ہے اور یہی اصول کائنات کے وجود میں آنے اور اس کے ارتقا کا باعث بنا ہے۔ گرمی یا حدت کے باعث مادہ پھیلتا ہے اور اس عمل کے ذریعے ہوا، آگ میں تبدیل ہو کر آخر کار ستاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے جبکہ اس کے متضاد "ٹھنڈا ہو کر گاڑھا ہونے کے اصول کے تحت" ہوا پہلے بادلوں کی شکل اختیار کرتی ہے اور جب درجہ حرارت اس سے بھی زیادہ گر جاتا ہے تو ہوا پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس طرح درجہ بدرجہ زمین چٹانوں کی شکل

اختیار کر لیتی ہے اور دنیا دوبارہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسی پہلے والی بنیادی ہوا میں گردش کرنے لگتی ہے۔ یہ دنیائیں درجہ بہ درجہ ایک دوسرے کے بعد جنم لیتی اور فنا ہوتی ہیں اور تھالی کی شکل جیسی زمین ہوا پر تیر رہی ہے۔"

ایونکس مکتبہ فکر کے بعد فیثاغورث کا زمانہ آتا ہے۔ اس مکتبہ فکر نے روح کے ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتقل ہونے اور انسانی روح جانور کے قالب میں منتقل ہونے کے نظریات پیش کرنے کے علاوہ عمل کے تسلسل کا نظریہ بھی پیش کیا۔ ان کے مطابق ایسی کسی دنیا کا تصور نہیں کیا جاسکتا جس میں ہندسوں کا وجود یا ضرورت نہ ہو یا تعداد کا بالکل تصور ہی نہ ہو۔ اس کائنات کی بناوٹ میں ایک سب سے نمایاں پہلو ہم آہنگی کا ہے۔ اور جب نسبت یا تناسب' ترتیب اور ہم آہنگی کے تصورات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو ان تمام چیزوں کا تعلق بھی اعداد سے ہوتا ہے۔ کائنات اور موسیقی دو ہم معنی اشیاء یا وجود ہیں۔ کائنات کی بنیادی فطرت اعداد سے مشتق ہے۔ جمع' تفریق' ضرب' تقسیم کا تعلق یقیناً اعداد یا ہندسوں سے ہے اور دوسری تمام سائنس جن کا تعلق حساب سے ہے ان کا تعلق بھی اعداد یا ہندسوں سے ہے۔ کائنات آپس میں مختلف جوڑوں اور متضادات پر مشتمل ہے۔ اور محدود اور لامحدود' طاق اور جفت' واحد اور جمع' دایاں اور بایاں' مذکر اور مونث' جمود اور حرکت' سیدھا اور ٹیڑھا' روشن اور تاریک' نیک اور بد اور گول اور لمبا دس ایسے متضاد جوڑے ہیں جن سے یہ کائنات معرض وجود میں آئی۔ ان کے خیال میں انصاف کا مطلب جیسا کرو گے ویسا بھرو گے اور چار (4) کا ہندسہ انصاف کے تصور کی نمائندگی کا حقدار ہے اور بعض نو (9) کے ہندسہ کو انصاف کے تصور کا نمائندہ مانتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق زمین کائنات کی مرکزی آگ کے گرد گردش کرتی ہے۔ ارسطو نے اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ "زمین ہی اس کائنات کا مرکز ہے۔"

فیثاغورثیوں کے بعد ایلیٹک مکتبہ فکر نے جنم لیا۔ اس مکتبہ فکر کا بانی

ایکسینو فینز (Xeno Phanas) تھا۔ اس کے خیال میں "دیوی ' دیوتا عام انسانوں کی طرح پیدا نہیں ہوتے بلکہ وہ ہمیشہ سے تھے چونکہ روحانی طاقت کو واحد ہونا چاہیے اس لیے سب سے بڑا دیوتا ایک ہے اور یہ خدا یا دیوتا انسانوں سے بالکل مختلف ہے بلکہ وہ انسانوں کا خالق ہے۔ وہ سارا آنکھ ہے' وہ سارا کان ہے اور سارا خیال ہے۔ خدا کی ذات ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر ہے۔ وہ ناقابل تقسیم ہے۔ وہ حرکت بھی نہیں کرتا۔ اس کے جذبات بھی نہیں ہیں اور اس کو کوئی غم یا پریشانی نہیں ہے۔" اس مکتبہ فکر کے دوسرے بڑے مفکر پارمینائیڈز (514 ق م) کے خیال میں "یہ دنیا عارضی پن اور تغیر و تبدل کا شکار ہے تمام چیزیں وجود میں آتی ہیں اور پھر فنا ہو جاتی ہیں۔ کوئی شے مستقل یا قائم نہیں۔ وجود (Being) اصل سچائی ہے جبکہ (Not Being) جھوٹ ہے۔ عدم وجود کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ تغیر پذیر اشیاء کی دنیا وہ ہے جسے ہم حواس خمسہ سے محسوس کرتے ہیں اور یہ حواس خمسہ سے محسوس ہونے والا جہان ایک فریب ہے۔ وجود عدم وجود سے بالکل مختلف ہے اور اس کا متضاد ہے۔ وجود میں تغیر و تبدل کا مادہ نہیں ہے اس لیے وہی اصلی' وہی دائمی اور مستقل ہے۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ وجود نے کبھی جنم نہیں لیا بلکہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بس وہ ہے۔"

کسی چیز کے تجریدی خیال کو حواس خمسہ سے نہیں بلکہ عقل و بصیرت اور استدلال کی قوت سے پہچانا جا سکتا ہے اور حواس خمسہ کے محسوسات اور عقلی قوت استدلال میں فرق نکالنا ہی آئیڈیلزم کی بنیادی صفت ہے۔ یہ ہمارے سامنے کی دنیا جسے ہم حواس خمسہ سے محسوس کرتے ہیں یہ فریب اور ظاہری دنیا ہے جبکہ اصلی حقیقت اس کے پیچھے مخفی ہے اور جسے حواس خمسہ نہیں پا سکتے۔ وجود عدم وجود میں سے کبھی جنم نہیں لے سکتا اور وجود نہ ہی جنم لیتا ہے اور نہ ہی فنا ہوتا ہے۔"

ایلیٹک مکتب فکر کا تیسرا اور آخری مفکر زینو (489 ق م) کہتا ہے کہ "آپس میں دو متضاد بیانات میں سے دونوں بیک وقت درست نہیں ہو سکتے۔ اگر

متعدد (Many) ہے تو پھر اسے لامحدود طور پر چھوٹا اور بڑا بھی ہونا چاہیے۔ اس کے مطابق بڑھنے یا پھیلنے کا عمل یا حرکت کے عمل کا تصور غیر حقیقی ہیں۔ متعدد کئی اکائیوں سے مل کر بنتا ہے بشرطیکہ اکائیاں اپنی ذات کے اندر ناقابل تقسیم ہوں۔ متعدد آخری حد تک چھوٹا ہے لیکن لامحدود طور پر بڑا بھی ہے۔ متعدد ہندسوں کی صورت میں بھی محدود اور لامحدود دونوں قسم کی صفات کا حامل ہے۔ ایک چیز ایک ہی وقت میں دو مقامات پر موجود نہیں ہو سکتی۔ اس لیے حرکت کا تصور ایک فریب ہے چونکہ محو پرواز جسم ہر لمحہ کسی ایک مقام پر ہوتا ہے اور ایک مقام پر ہونے کا مطلب غیر متحرک ہونا ہے۔ اس لیے پوری پرواز کے دوران وہ جسم بے حرکت ہوتا ہے' لہٰذا اجسام کی حرکت کا تصور ایک فریب ہے بلکہ ہر چند' ہر لمحہ ساکن' ساکت یا بے حرکت ہے چنانچہ حرکت کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

مابعد ہیراکلیٹس (535-475 ق م) نے نظریہ پیش کیا کہ "دراصل مسلسل تغیر و تبدل کا عمل ہی حقیقی ہے اور وجود یا مستقل صورت یا قیام وغیرہ سب فریب نظر ہے۔ حرکت اصل حقیقت ہے اور دنیا کی ہر چیز مسلسل تغیر و تبدل کے عالم میں ہے اور نئی نئی صورتیں اختیار کر رہی ہے۔ کوئی چیز ٹھہرتی ہے اور نہ ہی رکتی ہے۔ ہر چیز جو کل تھی وہ آج ویسی نہیں ہے۔ ہم ایک دریا میں داخل ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ ہر چیز کی اپنی باری ہے چیزیں جنم لیتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں۔ اس طرح چیزوں میں لحہ بہ لحہ تغیر و تبدل کا عمل جاری ہے۔ ہر چیز مسلسل بہاؤ میں ہے اور ہر روز طلوع ہونے والا سورج بھی نیا ہوتا ہے۔ تمام اشیاء آگ سے وجود میں آئی ہیں اور اسی میں واپس مل جائیں گی۔ روح بھی آگ سے مماثل ہے اور تمام ارواح ایک بڑی آفاقی آگ والی روح کا حصہ ہے۔ عقلی استدلال کے ذریعے ہم تغیر کے اصول اور قانون کو سمجھ سکتے ہیں جسے سمجھنے کے بعد انسان کے سامنے اس فانی دنیا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی اسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ بدی نیکی کا ایک لازمی جزو ہے۔ نیکی اور بدی کے درمیان اور نزع کا اصول اس دنیا کو قائم رکھے

ہوئے ہے۔ بدی کا دنیا میں اپنا ایک مقام ہے۔"

ہیرا کلیٹس کے بعد ایمپی ڈوکلز (495-435 ق م) نے فلسفہ پیش کیا کہ "دنیا کی اشیاء میں نہ تو کوئی بہت زیادہ یا حتمی اور مسلسل تغیر ہے اور نہ ہی زیادہ تخلیقی عمل ہے اور نہ ہی چیزوں کا کوئی حتمی فنا کا اصول ہے پھر بھی اشیاء جنم لیتی اور فنا ہوتی ہیں۔ مادہ بے جان اور بے حرکت ہے اور اس کے اندر جبلی یا خلقی طور پر کسی قسم کی حرکت کی صفت موجود نہیں۔ محبت اور نفرت ساری دنیا میں پائی جانے والی آفاقی قوتیں ہیں جو اپنا عمل پورا کر رہی ہیں۔ دنیاؤں کے وجود میں آنے اور پھر فنا ہونے کا اصول گول دائرے کی صورت میں ہے۔ یہ ایک چکر ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ بنیادی دائرے میں چاروں عناصر کا امتزاج بالکل مساوی ہے اور یہ تمام یکجان ہیں۔ اس دائرے میں محبت اور ہم آہنگی کی قوت رواں دواں ہے۔ ہم آہنگی کے اردگرد نفرت پھیلی ہوئی ہے اور یہ نفرت دائرے کے مرکز کی طرف بڑھتے ہوئے مرکز میں جدائی' پھوٹ اور افتراق کے جراثیم پیدا کرتی ہے۔ اور بالآخر یہ دائرہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن محبت کا جذبہ پھر سے چاروں عناصر میں منتقل ہو کر وہی بنیادی دائرہ یعنی دنیا قائم کرلیتا ہے۔ ہر شے کو محسوس کرنے کے لیے ایک خاص حس خمسہ موجود ہے۔"

بعد ازاں لیوی پلس اور ڈیمو کریٹس نے اپنے نظریات میں کہا کہ "اگر مادی ذرات کو تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزار کر چھوٹے ترین درجے تک پہنچا دیا جائے تو یہ ایک ناقابل تقسیم اکائی کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ ناقابل تقسیم اکائیاں ایٹم کہلاتی ہیں۔ یہی ایٹم مادے کے حتمی اور بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں جو لاتعداد اور لامحدود ہیں۔ یہ ایٹم اتنے چھوٹے اور باریک ہیں کہ انہیں حواس خمسہ سے محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ مادے کی ایک ہی قسم ہے اور یہ تمام آئیمز اسی ایک مادے کے بنے ہوئے ہیں اور قطعی طور پر غیر صفاتی ہیں۔ خلا بھی ایک وجود رکھتا ہے۔ مادی دنیا کے عمل میں کوئی عقل یا استدلال موجود نہیں ایک بے ارادہ مادی

عمل ان تمام مظاہر فطرت اور تغیر و تبدل کا باعث ہے۔ روح گول اور شفاف ذروں سے بنی ہوئی ہے۔ روح آگ کی غیر معمولی طور پر شفاف صورت ہے۔ موت کے وقت روح کے ذرات بکھر جاتے ہیں اور اس طرح روح بھی جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا دوسری زندگی ناممکن ہے۔ سکون قلب اور روحانی مسرت کے لیے دعا بہت ضروری ہے اور یہ دونوں چیزیں دولت کی بجائے دل و دماغ یا روحانی قناعت سے حاصل ہوتی ہیں۔"

ڈیموکریٹس کے بعد انیکسے گورس (500 ق م) نے کہا کہ سورج پتھر کا ایک گرم سرخ گولہ جبکہ یہ چاند مٹی کا بنا ہوا ہے۔ کسی چیز کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ اشیا کے وجود میں آنے کی اصل وجہ اجزائے ترکیبی کا باہم ہونا اور بکھر جانا ہے۔ اشیاء کے اجزائے ترکیبی پہلے سے اپنا وجود رکھتے ہیں۔ مادے کی تمام مختلف صورتیں حقیقی ہیں اور ذاتی صفات کی مالک ہیں۔ یہ مادہ نہ کسی دوسرے مادے سے نکلا ہے اور نہ کسی دوسری قسم کے مادے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ دنیا مادوں کے بے ربط مرکب کے ٹوٹنے سے وجود میں آئی۔ ہر مادے نے اجتماعی مرکب سے علیحدہ ہو کر اپنا علیحدہ وجود قائم کرنے کے لیے لامحدود وقت لیا۔ اور اب یہ مادہ بکھرنے میں بھی لامحدود وقت لے گا جب دنیا فنا ہو گی۔ ذہانت مادے کو متحرک کرتی ہے جس سے دنیا قائم ہے۔ ذہانت یا ارادے غیر فطرتی اور غیر جسمانی ہیں۔ ہر قسم کے جاندار تخلیق ہوئے ہیں لیکن ان کے درجات مختلف ہیں جن میں انسان بلند ترین درجے پر ہے۔ جب چاند اور زمین کے درمیان سورج حائل ہوتا ہے تو سورج گرہن ہوتا ہے اور جب زمین چاند اور سورج کے درمیان آ جاتی ہے اور زمین کا سایہ چاند پر پڑنے لگتا ہے تو چاند گرہن ہوتا ہے۔ سورج پونیشیا سے کئی گنا بڑا ہے اور زمین پر زندگی کی وجہ وہ جراثیم ہیں جو ماحول میں اپنا وجود رکھتے ہیں جن کو بارش کا پانی اوپر سے نیچے زمین پر موجود کیچڑ تک لے آیا اور وہاں وہ بار آور ہوئے۔ اس طرح زمین پر جراثیموں کے باعث زندگی کی ابتدا ہوئی۔"

یونانی ابتدائی فلسفے کا دور انیکسے گورس پر ختم ہوگیا۔ جس میں کائنات کی تشریح اور وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی۔ یونانی فلسفے کا دوسرا دور سوفسطائی سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں کائنات میں انسان کی حیثیت دریافت کی گئی۔ سوفسطائی پیشہ ور دنیاوی تعلیم کے علماء کا ایک گروہ تھا جو معاوضہ لے کر دنیاوی تعلیم دیتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ ریاست میں بلند سیاسی مقام حاصل کرنے کے لیے دنیاوی چالاکی' شاطرپن' حاضر دماغی اور چرب زبانی ضروری ہے۔ ان میں پروٹے گورس' گورجیاس پروڈی کس اور ہی آس قابل ذکر ہیں۔ پروٹے گورس سیاسیات' گورجیاس لسانیات' پروڈی کس گرائمر اور ہی آس تاریخ' حساب اور طبیعات کا ماہر مانا جاتا تھا۔ پروٹے گورس (480-410 ق م) کے خیال میں "انسان کی ذات ہی تمام چیزوں کا معیار ہے۔ اس دنیا میں نہ کوئی نیکی ہے اور نہ کوئی بدی۔ کمزور کے مفاد کے مقابلے میں طاقتور کا مفاد مبنی برحق ہے۔ طاقت ہی سب سے بڑا عقلی یا اخلاقی استدلال ہے۔ کسی چیز یا عمل کے بارے میں ہر قسم کی آرا درست ہیں۔ کسی چیز کے بارہ میں حتمی علم حاصل کرنا ناممکن ہے۔" گورجیاس نے اپنی کتاب

"Charach Teristic of the Sophistical Love of Paradox"

میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "کوئی چیز موجود نہیں اور اگر موجود ہے تو اس کے متعلق معلوم نہیں کیا جاسکتا اور اگر اس چیز کے متعلق جان بھی لیا جائے تو اس کے علم کو بتایا نہیں جاسکتا یعنی حواس خمسہ کے محسوسات کو پوری طرح اور واضح انداز میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔" بعد میں آنے والے سوفسطائی پولس' تھراسی میکس اور کریتیاس نے یہاں تک کہا کہ "ہر آدمی کی نظر میں کسی اخلاقی اصول کی مختلف اہمیت ہوسکتی ہے۔ اس لیے اصولی طور پر کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں بن سکتا۔"

سوفسطائیوں کی متذکرہ گمراہ کن تعلیمات کے دور میں سقراط منظر عام پر آیا۔ سقراط نے اپنے اقتصادی نظام میں برملا کہا کہ "اگر انسان سمجھے تو اسے رہنے کے لیے ایک چھوٹے سے مکان' کھانے کے لیے سادہ سی غذا اور پہننے کے لیے عام کپڑوں کی

ضرورت ہے اور اس کی یہ تمام ضروریات حکومت اسے بہم پہنچائے اور فرد اس کے بدلے میں اپنے پیشے کو پوری دلجمی اور شوق سے کرے کیونکہ معاشرے کا ہر فرد اپنے ذہنی رجحان کے مطابق کوئی نہ کوئی کام معاشرے کی خدمت کے لیے سرانجام دے گا تب ہی ریاست سے اپنی بنیادی ضروریات حاصل کرنے کا حقدار ٹھہرے گا۔ ریاست کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو عاقل و دانا اور منصف مزاج ہوں اور اپنے ذہنی رجحان کے مطابق اس کام کے لیے خصوصی طور پر تربیت یافتہ ہوں۔ حقیقی علم کی بنیاد عقلی استدلال اور ذہنی شعور ہے اور کسی چیز کا ایک خاص تصور ہی عقلی استدلال کی بنیاد ہے اور ایک عالم کبھی غلطی نہیں کرسکتا۔ نیکی ایک علم ہے لہٰذا سکھایا پڑھایا جاسکتا ہے۔ نیکی کی تمام قسمیں علم سے نکلتی ہیں اور تمام اخلاقیات علم سے جنم لیتے ہیں۔"

سقراط کے بعد افلاطون (429 ق م) نے اپنی تھیوری آف آئیڈیاز میں کہا کہ "انسانی علم کے دو ذرائع ہیں۔ ایک حواس خمسہ کے افعال اور دوسرا عقلی استدلال۔ حواس خمسہ سے مادی دنیا کی اشیاء کا تجربہ حاصل ہوتا ہے اور عقلی استدلال سے عمومی یا آفاقی تصورات و خیالات کا ادراک ہوتا ہے اور خیالات و تصورات کا جہاں اصل حقیقت اور سچائی ہے اور یہی حتمی وجود ہے جبکہ حواس خمسہ کا جہاں عدم وجود ہے۔ خیالات اشیاء میں پنہاں ہیں اور آفاقی تصورات وجود اور عدم وجود کے درمیان میں ہیں' کسی چیز کا آفاقی تصور ایک ہوتا ہے۔ خیال زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے جبکہ مادی اشیاء زمانی بھی ہیں اور مکانی بھی۔ خیال دائمی اور غیر متغیر ہے جبکہ حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء مسلسل تغیر پذیر ہیں۔ تصورات کی تین اقسام ہیں۔ اخلاقی تصورات جیسے انصاف' نیکی اور خوبصورتی۔ مادی اشیاء کے تصورات جیسے گھوڑا' انسان" درخت وغیرہ خصوصیات یا صفات کے تصورات جیسے بہادری' ہمدردی وغیرہ۔ نیکی کے اوصاف بدی اور انصاف کے ساتھ بے انصافی کا تصور موجود ہے۔ جس طرح ایک آفاقی تصور اپنے جیسی بہت سی چیزوں

کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک بلند تر تصور اپنے سے چھوٹے تصورات کی نمائندگی کرتا ہے۔ تمام تصورات مل کر ایک سب سے بڑے تصور کے تحت آتے ہیں اور یہ سب سے بڑا یا بڑا ترین تصور ایک ہے حتمی ہے ایک مکمل حقیقت ہے ایک جواز کی حقیقت رکھتا ہے یہ اس کے اپنے ہونے اور دوسرے تمام تصورات کے ہونے کا جواز ہے اور پوری کائنات کے ہونے کا جواز یہی سب سے بڑا تصور یا خیال ہے۔ یہ سب سے بڑا تصور یا خیال خدا کا ہے۔ محبت کا تعلق ہمیشہ خوبصورتی سے ہے۔ کسی جسمانی شکل میں پیدائش سے قبل انسانی روح بے جسم تصورات و خیالات کی دنیا میں سوچ بچار کے عالم میں تھی لیکن جیسے ہی وہ انسانی جسم میں داخل ہوئی حواس خمسہ میں مدغم ہو کر وہ اس جہاں کو بھول گئی جس میں وہ پہلے بے جسم پڑی تھی۔ یہ روح جب حواس خمسہ کے جہاں میں کسی خوبصورتی کو دیکھتی ہے تو اسے خوبصورتی کے اس ایک تصور کی یاد آتی ہے جو خیالات کی دنیا میں تھا اور جب روح ایک کے بعد دوسری خوبصورت چیز کو دیکھتی ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تو اس خوبصورتی کے ایک خاص تصور والی خوبصورتی ہے جو اپنے آپ کو ان خوبصورت چیزوں میں پیش کر رہی ہے۔ خوبصورت اجسام کے بعد روح خوبصورت ارواح اور پھر خوبصورت علوم کی طرف متوجہ ہو کر خوبصورتی کے ایک تصور کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے۔ خوبصورتی سے محبت کا جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور یہ جذبہ انسان میں اس لیے موجود ہے کہ وہ عقلی استدلال کی صفت سے متصف ہے۔"

• افلاطون کے نزدیک طبیعات کا تعلق مادی دنیا کے مظاہر فطرت سے ہے وہ دنیا کی تخلیق کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء آفاقی تصورات کی نقل یا عکس ہے۔ آفاقی خیالات اصل وجود اور حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء نیم حقیقی یا عدم وجود ہیں اور عدم وجود کا حتمی اصول مادہ ہے جسے آفاقی تصورات نے چیزوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ خدا نے سب

سے پہلے دنیا کی روح کو تخلیق کیا جو غیر مادی ہونے کے باوجود جگہ گھیرتی ہے۔ اس نے اس روح کو جال کی طرح خلا میں پھیلایا پھر اسے اندرونی اور بیرونی حصوں میں تقسیم کیا۔ یہ دونوں حصے نصف دائرے کی شکل میں ہیں اور ان کا مقدر یہ ہے کہ سیاروں اور ستاروں کے دائرے بن جائیں پھر وہ مادہ لے کر اسے چاروں عناصر سے روح کے خالی ڈھانچے میں باندھتا ہے جس سے کائنات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ انسانی روح بھی دنیا کی روح سے ملتی جلتی ہے اور یہی روح انسانی جسم میں حرکت کی وجہ ہے اور اسی دنیا میں انسان کا عقلی استدلال پنہاں ہے۔ انسانی روح کا تعلق آفاقی تصورات اور حواس خمسہ دونوں جہانوں سے ہے۔ یہ دو حصوں میں تقسیم ہے اور دونوں حصوں میں سے ایک حصہ پھر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اوپر والا حصہ عقلی استدلال والا ہے جو آفاقی تصورات کے جہاں کا ادراک کرتا ہے۔ روح کا عقلی استدلال والا حصہ غیر فانی ہے جبکہ غیر استدلالی حصہ فانی ہے اور یہ حصہ نیکی اور بدی میں تقسیم ہے۔

المختصر یونانیوں سے قبل کی قومیں سائنس اور دینیات کو ایک قرار دیتے ہوئے فطرت کے ہر عمل کا باعث کسی دیوتا کو ٹھہراتے تھے۔ یونانیوں میں تھیلیز (550-640 ق م) نے سب سے پہلے انکشاف کیا کہ سورج اور ستارے جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں دراصل آگ کے گولے ہیں۔ اس کے شاگرد' اناکسی مندار (540-610 ق م) نے کہا کہ کائنات ابتدا میں غیر متشخص اجزا پر مشتمل مادہ تھی۔ پھر اضداد کی رفتہ رفتہ علیحدگی وجہ وجود عالم بنی۔ ہیئت تاریخ میں مقرر شدہ مدت کے بعد بے شمار عوالم ارتقا پذیر ہوئے اور پھر فنا ہوتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ جاریہ ہے۔ زمین اپنے داخلی نظام کے توازن کی بنا پر ساکن ہے۔ تمام سیارے سیال تھے پھر خشک ہوئے۔ پانی میں رہنے والے جانور مجبوراً خشکی پر رہنے کے عادی ہوئے اور شروع میں انسان ایسا نہ تھا۔ اناکسی مینز نے کہا کہ ابتدا میں کائنات لطیف مادہ تھی پھر اس نے ہوا' بادل' پانی' زمین اور پتھر کی شکل اختیار کی اور مادے کی موجودہ

تینوں صورتیں گیس، مائع اور ٹھوس اس تغیر کی تدریجی منازل ہیں۔ زندگی اور روح ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انکساغورث (428-500 ق م) نے انکشاف کیا کہ مچھلیاں اور پودے سانس لیتے ہیں اور انسان کو جب ہاتھوں کے بل چلنے کی ضرورت نہ رہی تو آہستہ آہستہ انسانی علم نے سائنس کی شکل اختیار کی۔ ہراقلیفوس (470-530 ق م) نے کہا کہ تمام چیزیں مستقل طور پر متغیر اور رواں دواں ہوتی رہتی ہیں۔ مادہ میں بھی حرکت موجود ہے۔ تاریخ تکوین کے ہر چکر کی ابتدا اور انتہا آگ ہے۔ تمام اشیاء کی بود و نابود کی وجہ کشمکش ہے اور اگر کشمکش نہ ہو تو انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ تغیر کشمکش اور انتخاب کے عمل میں صرف قانون ابدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نظام ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ کوئی دیوتا یا انسان اس نظام کا خالق نہیں ہے۔ ایمپوڈوکلیز (445 ق م) نے کہا کہ اعضا کی تخلیق انتخاب سے ہوتی ہے۔ فطرت نظام ہائے جسمانی کے متعلق تجربات اور اختیارات کا عمل جاری رکھتے ہوئے مختلف طریقوں سے ترتیب دیتی ہے۔ عضویہ قائم رہ کر اپنی جنس کی تخلیق کرتا ہے۔ لوئی پوس (445 ق م) نے کہا کہ ہر چیز مجبور ہے جبکہ دیماقریطوس (360-460 ق م) نے کہا کہ دراصل جواہر اور خلا کے سوا اور کوئی چیز موجود ہی نہیں شے مدرکہ کے جواہر خارج ہو کر حواس خمسہ کی کسی حس سے مس کرتے ہیں۔ بے شمار عوالم تھے اور ہوں گے لمحہ بہ لمحہ سیارے متصادم ہو کر فنا ہوتے ہیں اور یکساں حجم اور صورت کے سالمات منتخب ہو کر مجتمع ہوتے ہیں جس سے نئی دنیائیں معرض وجود میں آتی ہیں۔"

ایتھنز کی پیچیدہ سیاسی زندگی نے سقراط اور افلاطون کو علم الحیات اور طبیعات پر تحقیق کام کرنے کی بجائے اخلاقیات اور سیاسیات پر کام کرنے پر مجبور کیا لیکن ارسطو نے اپنی ہمت عالی سے طبیعات اور اخلاقیات دونوں پر کام کیا اور زیادہ سے زیادہ مشاہدات اور تفصیلات فراہم کرتے ہوئے تمام علمی نتائج کے مجموعے کو منظم سائنس کی شکل عطا کی۔ ارسطو کے نزدیک "آفاقی تصورات فطرت کی دائمی

اشیاء کے سوا کچھ نہیں اور کسی مادی شے کا آفاقی تصور اس شے سے علیحدہ وجود نہیں رکھتا بلکہ ہر چیز کا آفاقی تصور اس چیز کی ذات کے حوالے سے ہے۔ آفاقیت ہی حتمی سچائی ہے لیکن یہ آفاقیت انفرادیت میں مظہر ہے۔ اصل حقیقت یا مادہ وہی ہے جو اپنی ذات میں مکمل ہے اور اسے اپنی ذات یا وجود کے ہونے کے لیے کسی دوسرے کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی چیز کا آفاقی تصور اس چیز کے مادے کے وجود کے بغیر ناممکن ہے۔ مادے سے مادے کی صفات کو الگ کرنے کا مطلب مادے کو مادے سے علیحدہ کرنا ہے۔ مادی اشیاء اور ان کا آفاقی تصور جدا نہیں ہوسکتے بلکہ ہر مادی چیز کا تصور اس مادی چیز کے اندر موجود ہے۔ مادی اشیاء کا آفاقی تصور ان اہم صفات اشیاء کے باعث ہے نہ کہ وہ اہم صفات مادی اشیاء اپنے آفاقی تصور کے باعث ہیں۔ مادے کی صفات آفاقی ہیں جو اپنے باعث مادے کا ایک آفاقی تصور پیش کرتے ہیں۔ کسی چیز کو بنانے میں چار علتیں کار فرما ہوتی ہیں۔ پہلی وہ مواد یا مادہ جس سے چیز کو بنایا جائے۔ پھر بنانے والے کی مہارت دوسری علت ہے۔ تیسری علت وہ تصور یا شکل ہے جس کے مطابق چیز نے تیار ہونا ہے اور چوتھی علت وہ خاص مقصد ہے جس کے تحت کوئی چیز تشکیل پاتی ہے۔ یہ چاروں علتیں آخر کار جذب ہو کر شکل (Form) کی حیثیت اختیار کرتی ہیں۔ چیز کے وجود میں آنے کا اصل مقصد اس چیز کی صورت کا اظہار ہے۔ اصل مقصد حرکت کی اصل علت ہے اور فطرت ایک خاص مقصد کی طرف متحرک ہے اور اسی اصول کے تحت انسان بڑے سے بڑا کام جذبے سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔"

ارسطو کے خیال میں "مادہ صورت میں موجود ہوتا ہے اور مادہ اور شکل ناقابل تقسیم ہیں۔ نہ مادہ کسی شکل کے بغیر اپنا وجود رکھتا ہے اور نہ ہی شکل مادے کے بغیر اپنا وجود رکھتی ہے۔ مادہ اور شکل دونوں رفیق ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے میں دو رفیق چیزوں کی طرح ملتے اور جذب ہوتے ہیں۔

مادی اشیاء کے وجود سے مادہ کا عمومی خیال یا تصور جنم لیتا ہے۔ شکل یا

صورت مادے کا آفاقی تصور ہے جو مادے کی وضاحت کرتا ہے۔ شکل ہی اپنے اندر کسی مادی چیز کے اس مقصد کو بھی رکھتی ہے جس کے لیے وہ چیز وجود میں آتی ہے۔
صورت میں مادے کی تمام صفات موجود ہیں اور مادے کی تمام صفات آفاقی ہیں۔

مادہ بنیادی طور پر ایک بے شکل مواد کی مانند ہے جو ہر مادی چیز کی ایک شکل کی بنیاد ہے۔ مادہ کی نہ کوئی خاص صفت یا کردار ہے اور نہ ہی کوئی خاص نقش ہے۔ اس بے کردار، بے صفت اور بے نقش مادے کو جو چیز ان صفات سے متصف کرتی ہے وہ شکل ہے اور ایک چیز کو دوسری چیز سے صرف صفات ہی کی بنیاد پر الگ یا علیحدہ یا ممیّز کیا جاسکتا ہے۔

مادہ ایک اہلیت یا امکان کی مانند ہے۔ جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کی چیز بن سکتا ہے لیکن جو چیز اس اہلیت یا امکان کو کسی چیز میں تبدیل کرتی ہے وہ شکل ہے۔ ایک خاص مقصد مادے کو متحرک کرتا ہے اور یہ خاص مقصد بھی اس شکل کے اندر موجود ہے لہٰذا جب مادے میں شکل کا عنصر موجود ہوتا ہے تو ہر مادہ یکساں طور پر متحرک یا تبدیل ہوتا ہے۔

مادہ اپنے اندر اہلیت اور امکان کی صفات رکھتا ہے یہ کسی بھی شکل میں آکر حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے اور یہی مقصدیت ہی اصل قوت یا اصول محرکہ ہے۔
حرکت کا عمل ایک اندرونی خیالی کشمکش ہے جو کسی چیز کو حرکت پر مجبور کرتی ہے اور وہی ایک خاص مقصد ہے۔

مادہ ایک خاص مقصد کے تحت حرکت کرتا ہے اور یہی مقصدیت اس پر اثر انداز ہو کر اسے متحرک یا تبدیل کرتی ہے۔ مقصد مادے سے نہ صرف پہلے موجود ہے بلکہ یہ اس کے اندر پنہاں ہے۔ مقصد مادے میں حرکت کی علت ہے اور منطقی طور پر علت اپنے معلول سے پہلے ہوتی ہے لہٰذا یہ حرکت یا تبدیلی پر مقدم ہے۔
مقصد اور شکل کا اصول خیال اور حقیقت میں حتمی اولیت رکھتا ہے۔ مادے کو امکان یا اہلیت کی حالت سے ایک صورت یا شکل (Form) میں لانے والا یہی مقصد ہے۔

مقصد ہی فارم کا اصول ہے اور فارم آفاقی ہے۔ تصور یا خیال آفاقی ہونے کے باوجود باقاعدہ مادی وجود نہیں رکھتا بلکہ صرف خیال ہی کی حد تک حتمی اور حقیقی ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز کا ایک مقصد اور عمل ہے۔ مقصد صورت میں موجود ہے لہٰذا تخلیق کائنات یا دنیا کی تخلیق کا سارا عمل وہ مرحلہ ہے جب مادہ جو کہ اہلیت اور امکان کی حالت میں ہے خود کو صورت کے ذریعے ظاہر کرتا ہے یا صورت میں تبدیل ہو کر اپنا اظہار کرتا ہے۔ دنیا کی جس چیز پر بھی نظر ڈالی جائے اس میں ایک خاص مقصد نظر آتا ہے۔

پوری کائنات میں فقط انسان ہی ایک ایسی جنس ہے جو شعوری طور پر اپنے ذاتی مقاصد سے آگاہ ہے اس کے علاوہ بعض جانور اور جاندار بھی بظاہر عقلی عمل کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کا عمل عقلی یا شعوری نہیں بلکہ جبلی ہے اور ان کا عمل خود ریزن ہے اور یہ ریزن انسان سے نچلے درجے کی چیزوں میں جبلی اور غیر شعوری صورت میں اپنا اظہار کرتا ہے۔

دنیا کی ساری حرکت دراصل صورت کی اس کوشش کا نتیجہ ہے جو مادے کو اپنے اندر ڈھالنے کے لیے کرتی ہے۔ مادے میں فطری قوت مدافعت کے باعث ضروری نہیں ہے کہ صورت ہمیشہ اپنی اسی کوشش میں کامیاب ہو جائے اسی لیے یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ مادہ پوری طرح صورت میں ڈھل جائے اس لحاظ سے نیچر (Nature) کافی حد تک اپنے مقصد میں ناکامیاب ہے۔"

ارسطو کے مطابق "ہر چیز کی تخلیق میں چار علتیں کار فرما ہوتی ہیں۔ پہلی علت مادہ ہے۔ دوسری علت وہ مہارت ہے جو مادے کو ایک شکل دیتی ہے۔ تیسری علت وہ بنیادی تصور ہے جس کے مطابق مادے کو شکل ملتی ہے، اور چوتھی علت ایک خاص یا عظیم مقصد ہے جس کے تحت پہلی تین علتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ یہ مقصد صورت (Form) میں موجود ہے چونکہ حرکت اور تبدیلی ایک مقصد کے تحت واقع

ہوتی ہے لہٰذا اس کی دوسری علت تیسری اور چوتھی علت میں شامل ہو جاتی ہے مقصد مادے سے پہلے موجود ہوتا ہے جبکہ مقصد خود تیسری علت میں موجود ہے اس طرح تیسری علت مادے سے مقدم ہے اور تیسری علت ہی خدا ہے جو پہلی علت پر بھی مقدم ہے بلکہ یہ سب پر مقدم اور حتمی حقیقت ہے اور چونکہ یہ تینوں علتیں مادی نہیں ہیں بلکہ خیالی ہیں لہٰذا خدا بھی ایک خیال ہے۔"

ارسطو کے نزدیک خدا خیال بھی ہے اور عقلی استدلال بھی۔ وہی حتمی اور آخری مقصد ہے اور تمام مادی وجود بے اختیار ایک خاص کشش کے تحت اس کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ خدا تمام چھوٹے مقاصد کے معاملے میں ایک بڑا اور حتمی مقصد ہے۔ جیسا کہ ہر چیز کا مقصد یہ ہے کہ اس کی ذات کی تکمیل ہو لہٰذا خدا چونکہ سب سے اعلیٰ اور عظیم ترین مقصد ہے اس لیے وہ ہر طرح سے مکمل ہے تکمیل اس کی ذات پر پوری ہوتی ہے۔ خدا ماہر اور کاریگر بھی ہے اور اصل قوت محرکہ ہے۔ تمام حرکت اور تبدیلی اسی کے باعث ہے۔

ارسطو کے نزدیک "حرکت اور تبدیلی کی بنیادی وجہ ایک عظیم تر مقصد کی کشش اور لگن ہے اور ہر چیز کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد کی طرف حرکت کرے اور چونکہ پہلا محرک ہی تمام چیزوں کو اپنے خاص مقصد کی طرف حرکت دیتا ہے اس لیے وہ خود بے حرکت ہے اور یہ اس لیے بھی ہے کہ حرکت مادے کو اپنے اصل مقصد کی شکل کی طرف بڑھانے کا ایک مرحلہ ہے اور چونکہ سب سے اعلیٰ یا عظیم تر صورت سے بڑھ کر کسی اور صورت کا کوئی اور درجہ یا مقام نہیں ہے لہٰذا اعلیٰ یا عظیم ترین صورت کے لیے اپنے سے بہتر کی طرف بڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے لہٰذا اسے حرکت کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

یہی علت دراصل مقصدیتی علت ہے جو ایک مقصد کے حوالے سے کام کرتی ہے۔ یہ علت مادی نہیں بلکہ خیالی طور پر مادے پر مقدم ہے یا اس سے قبل ہے اس لیے یہ صرف منطقی طور پر تمام یا ہر قسم کی ابتدا سے قبل یا اول ہے جیسا کہ اس

کائنات کی وقت کے لحاظ سے کوئی ابتدا نہیں ہے اسی طرح وقت کے لحاظ سے اس کی کوئی انتہا بھی نہیں ہے۔"

ارسطو کے نزدیک "صورت (Form) چونکہ آفاقی ہے لہٰذا وہ خیال ہے اور خدا خیال کا خیال ہے۔ وہ صرف اپنی ہستی یا ذات کو سوچتا ہے وہ نہ اپنی ذات یا ہستی کا فاعل ہے اور نہ ہی مفعول۔ وہ آفاقی تصورات کا خالق ہے اور آفاقی تصورات کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ ابدی رحمت میں رہتا ہے اور اس کی ابدی رحمت یہ ہے کہ وہ مسلسل اپنی ذات کی تکمیل کے حسن کے بارہ میں سوچتا اور فکر کرتا ہے اور یہی فکر اور سوچ اس کی ابدی رحمت ہے۔

خدا ایک ایسا محرک ہے جس کو کوئی حرکت نہیں دیتا۔ وہ جسم معریٰ ہے۔ وہ منقسم نہیں ہو سکتا۔ لامکان ہے۔ اس کی کوئی جنس نہیں۔ جذبے سے خالی ہے' تغیر سے معریٰ ہے' کامل اور ابدی ہے' وہ دنیا کی تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ اسے حرکت دیتا ہے۔ دنیا کے تمام اعمال و افعال کا محرک وہی ہے۔ وہ دنیا کو اس طرح حرکت دیتا ہے جس طرح محبوب چیز محب کو حرکت میں لے آتی ہے۔ وہ فطرت کی علت نمائی اور خالص توانائی ہے۔ وہ ان تمام کل کو یہ قوت بخشتا ہے کہ جزو و کل اپنی غائیت کو پہچاننے لگتے ہیں۔ خدا وہ روح ہے جسے شعورِ ذات حاصل ہے یہ روح بڑی پراسرار ہے اس سے کوئی فعل سرزد نہیں ہوتا اسے کسی شے کی تمنا نہیں وہ خود تمام اشیاء کی مائیت اور علت نمائی ہے۔"

ارسطو نے فلسفہ حقیقت افلاطون کے فلسفہ مثالیت کے رد عمل کے طور پر پیش کیا۔ ارسطو کے خیال میں "مادہ ہی بنیادی طور پر اپنی اصل میں حقیقت اولیٰ ہے اور مادی دنیا اپنی ہیئت میں ہی حقیقی اور ابدی دنیا ہے اور یہ اپنی وجودی ہیت میں اصل ہے۔ کائنات اور موجودات محض انسان کے ذہن میں موجود تصورات کا عکس ہی نہیں بلکہ انسانی ذہن کا تصوراتی مشاہدے سے ہٹ کر بھی اپنا وجود رکھتے ہیں اور کائنات معروضی حواس ہے۔ کائنات ایک اصل اور ٹھوس ابدی حقیقت ہے جس کا

حواس کے ذریعے مشاہدہ ممکن ہے اور اس کے موجودات کو اپنی زندگی کی تکمیل کے لیے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ کائنات میں تغیر اور تبدیلی بھی ایک حقیقت ہے لیکن یہ فطرت کے قوانین کے تابع عمل میں آتی ہے اور اس سے کائنات کو ایک مسلسل ساخت ملتی ہے۔

انسان ایک حیاتیاتی وجود ہے جو نہایت ہی اعلیٰ قسم کے اعصابی نظام اور ایک معاشرتی مزاج کا عامل ہے۔ ذہن یا روح دراصل عضویہ کے ایک اعلیٰ اور پیچیدہ فعل کا نام ہے۔ مادی کائنات انسانی ذہن میں موجود تصورات سے علیحدہ ٹھوس مادی وجود رکھتی ہے اور یہ ایسے قوانین کے تحت منظم ہے جن پر انسان کا بس نہیں بلکہ انسان بذات خود قوانین کا تابع ہے۔ انسان بحیثیت مادی وجود اور اعلیٰ و پیچیدہ عضویے کے منظم کائنات کا ایک حصہ ہے جس کی تخلیق دیگر مظاہر فطرت کی طرح بامقصد ہوئی۔"

ارسطو کے نزدیک "کائنات کا موجودہ وجود" مواد حقیقی" صرف اور صرف ایک ہے۔ مبداء کائنات مادہ ہے اور مادے کے علاوہ کوئی اور حقیقت مطلقہ موجود نہیں۔ حیات بھی اسی مادے کی طبعی' کیمیائی ترکیب کی لطیف ترین صورت ہے۔ نفس یا ذہن بھی اسی مادے کی ایک عضویاتی ترکیب کا موقتی مظہر ہے۔"

ارسطو کے نزدیک "مادہ ہی تمام کائنات کا مبداء اولیٰ اور جزو اساسی ہے۔ساری کائنات کی ابتدا مادے سے ہوئی۔ مادے کے علاوہ کوئی شے حقیقی نہیں پوری مادی و طبعی دنیا مادی حقیقتوں اور جوہروں کا ایک میکانکی کل ہے جو ایک دوسرے پر قوانین حرکت کے تحت عمل اور رد عمل میں مصروف ہیں موجود شے کی توجیہہ مادہ اور حرکت کی اصطلاحوں سے کی جاسکتی ہے۔ کائنات کبھی خلق نہیں کی گئی بلکہ یہ ایک ابدی عمل ہے۔"

ارسطو کے نزدیک "دنیا اپنی اصل میں ماورائے کائنات کوئی تصوراتی ابدی حقیقت نہیں بلکہ یہ اپنی مادی شکل میں انسانی حواس کو جیسے نظر آتی ہے ویسے ہی

ہے۔ کائنات کی اصلیت اور عقلیت اور قدرتی ترتیب موجودات کائنات کی مختلف خاصتیں ہیں۔ علم کائنات موجدات کائنات کی حقیقت کا نام ہے۔ حقیقت تک رسائی کے لیے جو ذرائع بھی اختیار کئے جاتے ہیں وہ ذرائع علم ہیں اور انسانی حواس بہترین ذریعہ علم ہے۔

اس کے نزدیک "وقت کے ساتھ انسان نے علوم کے حصول میں عروج حاصل کیا اور ان حاصل کردہ علوم کی سچائی کو آزمایا بھی گیا۔ لہٰذا مجموعی طور پر اس حوالے سے علم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ موجودات کائنات کی اصلیت اور حقیقت کو انسان کے لیے آسان تر بنادے۔"

ارسطو کے نزدیک "اقدار بنیادی طور پر معروضی ہوتی ہیں اور معروضیت دراصل حقیقت کی ایک صفت ہوتی ہے جس کا انحصار کسی شخص کی نفسی ترجیحات پر نہیں ہوتا۔ کائنات میں ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون موجود ہے جس کو دلیل کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے اور جس کا اطلاق تمام افراد پر بطور عاقل انسانوں کے ہوتا ہے۔ اس لیے اقدار مستقل، ابدی، غیر متغیر اور غیر زوال پذیر ہوتی ہیں۔"

آیئے اب ارسطو کے فلسفہ اخلاقیات کے اہم جزویات کا جائزہ لیتے ہیں۔

# ارسطو کا فلسفہ اخلاقیات

ارسطو کے خیال میں ہر انسان خوشی اور سکون کا متلاشی ہے اور اصل خوشی وہ ہے جو اچھے کاموں سے حاصل ہوتی ہے۔ ساری کائنات میں ہر چیز کا ایک خاص مقصد ہے اور اسی خاص مقصد کا حصول ہی اس چیز کا کردار یا عمل ہے لہذا کائنات کی ہر چیز کی اچھائی یہ ہے کہ وہ اپنا کردار درست طور پر ادا کرے۔ انسان کی حقیقی راحت حسیاتی لذت میں نہیں ہے۔ ایسی خوشی حیوانات جن کا ہر عمل جبلی ہوتا ہے حاصل کرتے ہیں جبکہ انسان کا ہر حقیقی عمل عقلی استدلال کی بنیاد پر ہے۔ لہذا انسان کو حقیقی خوشی عقلی استدلال کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

انسان عقلی استدلال کے علاوہ حواس خمسہ کی وجہ سے حسیات کا بھی اسیر ہے۔ حواس خمسہ انسانی جسم کا حصہ ہیں اس لیے انسان حسیات سے بھی اسی طرح متاثر ہوتا ہے جیسے عقلی استدلال سے۔ عقلی استدلال انسانی زندگی کے طور اطوار میں پنہاں ہے اور نچلے اور چھوٹے درجے کی اچھائی یا جبلت' اس کے جذبات اور حسیاتی بھوک سے منسلک ہے۔ اس کیفیت میں انسان پر عقلی استدلال' اخلاق اور خیال چھایا ہوتا ہے اور اس مقام پر وہ خدا کا پرتو بن جاتا ہے۔ بیرونی حالات و وسائل بھی انسان کو اعلی و ارفع درجے کی اچھائی اور اخلاق کے حصول میں معاون و

مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک امیر شخص کو اپنی دنیاوی دولت کے سبب فراغت میسر آتی ہے اور وہ آزادی سے فلسفیانہ نظریات کا مطالعہ کر کے اعلیٰ و ارفع اخلاقیات تک پہنچ سکتا ہے۔

انسان کے اندر موجود سفلہ جذبات اور حیاتی بھوک کو عقلی استدلال سے آہستہ آہستہ مسلسل کوشش اور مجاہدے سے قابو پایا جاسکتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسان میں آہستہ آہستہ اخلاقی عادات پیدا کی جائیں۔ جن لوگوں میں عقلی و اخلاقی استدلال کی حیثیت کم درجہ کی ہوتی ہے ان لوگوں پر ان کے سفلہ جذبات اور حیاتی بھوک کسی وقت بھی غلبہ پا کر ان کے عقلی استدلال کی قوت کو مفلوج کر سکتی ہے۔ لہٰذا یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے استدلال و انصاف کے اصولوں کی حتمی وضاحت کر کے ان کے آفاقی تصورات قائم کئے جائیں اور بعد ازاں انہیں عوام کی رضامندی اور منظوری سے قانون کی شکل یا حیثیت دی جائے۔

نیکی کا مطلب سفلہ جذبات اور حیاتی بھوک پر عقلی استدلال کے ذریعے غلبہ پانا ہے۔ سفلہ جذبات کو عقلی استدلال کے ذریعے مکمل طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر اعلیٰ و ارفع درجہ ادنیٰ درجہ کو ختم کر دے تو انسانی نفسیات کا ارتقاء رک جائے گا۔ اس لیے حیاتی بھوک اور عقلی استدلال دونوں کا ہونا ضروری ہے۔

بصیرت نیکی کی علت بھی ہے اور معلول بھی۔ علت اس لیے کہ جو شخص گہری بصیرت رکھتا ہے وہی صحیح طور پر جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور معلوم اس لحاظ سے کہ گہری بصیرت مسلسل کوشش اور ریاض سے پیدا ہوتی ہے۔

بہادری دراصل بزدلی اور اندھی دلیری کے درمیان اور معتدل دراصل سخاوت، کنجوسی اور فضول خرچی کے درمیان ایک رشتہ، تعلق یا اعتدال کا ذریعہ ہے۔

انصاف کی دو قسمیں ہیں۔ Distributive اور Corrective-

Distributive انصاف اچھے اور باصلاحیت افراد کو ان کے کارناموں یا کارکردگی

کے مطابق درجات یا مراتب عطا کرتا ہے جبکہ Corrective انصاف مجرموں کی اصلاح کے لیے ان کے جرائم کے مطابق سزا دیتا ہے۔ فرد فطری طور پر آزاد ہے اگر وہ قانون اور انصاف کی طرف سے وارد ہونے والی سزا سے نہیں ڈرتا تو وہ اپنی مرضی سے اچھا یا برا راستہ اختیار کر سکتا ہے لیکن برے کام کی صورت میں قانون کی طرف سے اسے سزا ضرور ملے گی۔ ارسطو اس عمل کو فطری آزادی کا نام دیتا ہے۔

سیاسی فکر کے آغاز کا تعین بڑا دشوار ہے البتہ چھٹی صدی عیسوی میں یونان میں شہری ریاستوں کی ابتداء ہو چکی تھی۔ آیئے چھٹی صدی سے افلاطون تک یونانی ریاستوں میں موجود سیاسی فکر کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ارسطو کے فلسفہ سیاسیات کا دور حاضر کے ماہرین کی تنقید کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔

# ارسطو کا فلسفہ سیاسیات

علم سیاسیات انسانی زندگی' اس کے نظام اور اس کے تدریجی نشوونما سے بحث کرتا ہے اور اس کا دوسرے معاشرتی علوم جن میں اجتماعیات' تاریخ' اخلاقیات' معاشیات' علم الانسان اور نفسیات شامل ہیں سے گہرا تعلق ہے۔ سیاسیات کو تین تاریخی' نظری اور علمی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے تاریخی حصہ میں ابتدا سے آخر تک ہر دور کے فلسفیوں کے نظریات' نظری حصہ میں سیاسیات کے اصول اور علمی حصہ میں مخصوص نظام کو بنانے یا کسی مجوزہ نظام کو عمل میں لانے کی تدابیر اور تراکیب زیر بحث آتی ہیں۔

سیاسیات اگرچہ معاشی نظام کی ہر شکل میں موجود ہے لیکن اس کا خاص موضوع ریاست ہے۔ ریاست کا ہر دور میں مختلف مفہوم رہا ہے اور اس کی تعریف اور شکل ہر دور میں بدلتی رہی ہے۔ یونان میں ریاست کی شکل ایک شہر تک محدود تھی جبکہ قرون وسطیٰ میں اس کی حیثیت عالمگیری اور دور جدید میں اس کا دائرہ قوم یا نسل' زبان یا تہذیب کے مطابق ہے

سیاسی فکر کے آغاز کا تعین بڑا دشوار ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی خاص یا مخصوص علاقے کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ لفظ Politics دراصل یونانی اصطلاح

پولس (Polis) سے اخذ شدہ ہے جس کے معنی "شہری مملکت سے متعلق امور" کے ہیں اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ سیاسی فکر کا باقاعدہ آغاز قدیم یونان سے ہوا تھا۔ یونان میں بیداری کی ابتدا ساتویں صدی عیسوی میں اس وقت شروع ہوئی جب کسان سونے اور چاندی کے سکے رائج ہونے کی وجہ سے بدحال ہوئے اور فوجی طبقہ کاشتکاروں پر چھا گیا۔ ساہوکاروں نے کسانوں کی زمینیں خرید لیں اور کاشتکاروں نے معاشی دشواریوں کے پیش نظر ان کی غلامی کو قبول کر لیا۔ اس نازک حالت میں "ڈلفی" کی غیبی آواز نے اخلاقی تعلیم شروع کی جس کا معاشرہ کے ہر طبقہ پر گہرا اثر پڑا اور اس تعلیم کے زیر اثر ایسے قانون ساز پیدا ہوئے جنھوں نے یونان کے لیے سیاسی دستور مرتب کئے۔ ریاست تھیوری (Theory) کا آئین پروٹے گورس اور یونان کی خاص ریاست ایتھنز کا آئین سولون (Solon) نے بنایا۔

یونان میں شہری ریاستوں کی ابتدا چھٹی صدی قبل مسیح میں اس وقت شروع ہوئی جب معاشی انقلاب موثر ہو چکا تھا۔ سپارٹا میں ایک فوجی اشرافی حکومت قائم ہوئی جسے لی کر گیس کے قوانین نے مزید مضبوط بناتے ہوئے کاشتکاروں کو زمینداروں کے عملاً غلام بنا دیا۔ دوسری جانب ایتھنز کی ریاست میں سولن کے آئین نے جمہوریت کا بیج بویا۔ سولن نے حتی المقدور معاشرے میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب رہا۔ اس نے اپنی نظموں میں کہیں کہیں ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جن کو وہ بہتر سمجھتا تھا اور جن کو اس نے ایتھنز کے دستوری قوانین بناتے وقت مدنظر رکھا تھا۔ اس نے کاشتکاروں کا قرضہ منسوخ کرکے ان کو سکھ کا سانس لینے کا موقع دیا۔ ہر فرد کو اس بات کا حق دیا کہ وہ محتاج اور بے بس لوگوں کی طرف سے عدالت میں انصاف طلب کرے۔ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک جیوری مقرر کی جس کا انتخاب عوام میں سے ہوتا تھا۔

سولن کے شہر چھوڑ جانے کے بعد اس کا رشتہ دار پی سس ٹرے ٹس چھوٹے

چھوٹے زمینداروں کی مدد سے ایتھنز کا بادشاہ بنا۔ اس نے ان زمینداروں کی مالی مدد کر کے ان کی مالی مشکلات میں مزید کمی کی۔ اس نے وہ تمام ادارے قائم رکھے جو سولن کے آئین کے مطابق معرض وجود میں آئے تھے۔ بعد ازاں کلائیس تھینز نے ریاست کی آبادی کو نئے سرے سے نئے اصولوں کے تحت تقسیم کیا اور کلیسا کو ملک کا فرمانروا بنا دیا۔ اس نے کلیسا کی منتخب کردہ دس کمیٹیوں کو عملی اختیارات دے کر مکمل جمہوریت نافذ کی۔

اس دور میں سپارٹا میں شہریوں کو زمین کی ملکیت کا حق تھا لیکن کھانا سب ایک ساتھ کھاتے تھے اور ہر شہری کو اناج وغیرہ کی ایک خاص مقدار اپنے حصے کے طور پر مہیا کرنا پڑتی تھی۔ شہری ایک خاص وردی پہنتے تھے اور ان کے کھانے کی چیزیں مقرر تھیں۔ کریٹ کے جزیرے میں تمام زمینیں ریاست کی ملکیت تھیں۔ ریاست ان پر کاشت کرواتی اور پیداوار شہریوں کے صرف میں یکساں آتی تھی۔ ایتھنز کی ریاست چاندی اور پتھر کی کانوں اور جنگلوں کی مالک تھی اور اس میں شہریوں کی ملکیت پر ایک حد تک نگرانی رکھی جاتی تھی۔ مل کر کھانے اور زمین کی ملکیت میں شرکت کی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی تعلیم دینا ریاست کی ذمہ داری میں شامل تھا۔

سولن کے بعد فیثاغورث اور ای او نیا کے فلسفیوں نے بہت سے ایسے اصول مدون کیے جن کا بعد کے آنے والے فلسفیوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ فیثاغورث نے ماہر ریاضیت ہونے کے باوجود ایک خاص فلسفہ حیات روشناس کروایا جس کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ "ایک عدد اس وقت تک سالم رہتا ہے جب تک اس کے اجزا برابر ہیں۔ ریاست کی بنا انصاف پر اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس کے اجزا میں مساوات ہو اور انصاف کا مقصد مساوات کا قائم رکھنا ہے۔ انسان کی تین قسمیں ہیں عقل پرست' شہرت پرست اور دولت پرست اور یہ تینوں قسمیں معاشرے اور ریاست کے اجزا ہیں۔" ہیریک لی ٹس نے کہا کہ "انسان کو اپنی

زندگی قانون کے مطابق بسر کرنا چاہیے تمام انسانی قوانین ایک قانون الٰہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ سوفسطائی پروٹے گوریس نے خیال ظاہر کیا کہ "ریاست کی بنیاد اور اس کے قائم ہونے کی محرک انسانی ضروریات ہیں۔ ادب اور اخلاق کے اصول خدا کی طرف سے براہِ راست نازل ہوتے ہیں اور ان کے بغیر ریاست کی حیثیت افراد کے ایک مجموعے سے زیادہ نہیں ہوسکتی اور اس کا مقصد صرف انسانی زندگی کی ادنیٰ ضرورتوں کو رفع کرنے تک محدود رہتا ہے۔ ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے اور ریاست قانون کے ذریعے سے سیاسی اور اخلاقی زندگی کو بہترین شکل دیتی ہے۔" سو فسطائی فے لی نے کہا کہ "تمام سیاسی دشواریوں کی وجہ معاشی بدنظمی ہے" اور سو فسطائی ہپوڈے مس نے خیال ظاہر کیا کہ "آبادی کو کسان، دستکار اور سپاہی کے تین طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیے اور حاکموں کے انتخاب کا حق ان تینوں طبقوں کو یکساں ہونا چاہیے۔ مزید براں زمین کو بھی تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے ایک وہ جو کسان کی ذاتی ملکیت ہو۔ دوسری وہ جو ریاست کی ملکیت ہو جس سے سپاہی طبقے کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور تیسری وہ جو مذہبی اغراض کے لیے وقف ہوں۔"

ایتھنز کی جمہوریت کا نصب العین 441 ق م میں سپارٹا کی جنگ کے آغاز تک قائم رہا لیکن جلد ہی لوگ بے اصولی اور بے غرضی کی طرف راغب ہوگئے۔ سقراط اور افلاطون ایتھنز کی سیاسی اور اخلاقی تنزلی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "تنزلی کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایتھنز کے لوگوں کو اخلاق و معاشرت کا صحیح علم حاصل نہ تھا جب تک ان کی ذہنیت پر ان کے رہبروں کی روایات اور قدیمی اخلاقی تعلیم کا اثر رہا وہ سنبھلتے رہے لیکن ایرانی جنگوں میں فتح یاب ہونے کے ساتھ ہی عقلیت کا دور شروع ہوا اور عقل کی پرستش میں لوگ اس آئین حیات کو بھول گئے جس نے اس وقت ان کی راہنمائی کی تھی۔ چنانچہ یونان کی سیاسی اور اخلاقی زندگی میں انتشار پیدا ہوا اور ایک صدی کے اندر اندر نہ صرف ایتھنز کی عظمت خاک میں مل گئی بلکہ تقریباً یونان کی تمام شہری ریاستیں تباہ ہوگئیں۔"

ایتھنز کے بگڑے ہوئے سیاسی اور اخلاقی فلسفے کے خلاف سب سے پہلے سقراط (470-399 ق م) نے بغاوت کی اور کہا کہ "قانون کی پیروی ہر شخص کا اخلاقی فرض ہے اور قانونی سزا سے گریز کرنے کا اس شخص کو بھی حق نہیں ہے جسے یقین ہو کہ وہ بے گناہ ہے۔ مدبری ایک فن ہے جس میں بغیر استعداد اور تعلیم کے مہارت حاصل نہیں ہوسکتی۔ ریاست اور سیاسی زندگی کا مقصد اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ایسی شخصیتیں جن کا علم اور عمل کامل ہو اس کی رہبر اور حکمران بنائی جائیں۔ سیاسی قابلیت کوئی ادنیٰ چیز نہیں جس کا ہر کس و ناکس ہر درزی اور قلعی گر دعوے دار ہوسکے۔ ریاست کا کام ماہران سیاست کے بغیر نہیں چل سکتا ہے اور سیاسی زندگی کی اصلاح ان لوگوں کے بغیر ممکن نہیں جو ہر علم و ہنر اور اخلاقی صفت میں کامل ہوں۔ ناجائز طرز عمل اور وہ زیادتیاں جو بے اصول حکمران کرتے ہیں ان کی ذات کو بھی اتنا ہی صدمہ پہنچاتی ہیں جتنا اوروں کو۔ سیاسی اقتدار ان ہی لوگوں کا حق ہے جو اس کی ذہنی اور روحانی استعداد رکھتے ہیں۔ صرف فائدہ حاصل کرنے کو زندگی کا مقصد بنانا ایک انتہائی ادنیٰ معیار ہے۔"

سقراط کے بعد افلاطون نے اپنی تصنیف "الجمہوریہ" میں اخلاقی، مافلسفیانہ، مافوق الطبعی، مذہبی، تعلیمی، نفسیاتی اور تاریخی عقیدوں کی آمیزش سے ایک ایسا فلسفہ حیات مرتب کیا جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل کے لیے رہبری کی حیثیت رکھتا ہے۔ افلاطون کے مطابق "ریاست کا قیام اس وجہ سے عمل میں آیا کہ انسان خود اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔ ابتدائی شکل میں ریاست صرف ایک بستی ہوتی ہے۔ جس میں کاشتکار اور مختلف قسم کے دستکار آباد ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں محض آسودگی مدنظر ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ حفاظت کی ضرورت سپاہیوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیتی ہے جس میں جسمانی خواہشوں کے علاوہ اولالعزمی اور جوش کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ ترقی کرتے کرتے سپاہیوں میں ایسے افراد سامنے آتے ہیں جن میں دیگر اوصاف کے علاوہ عقل اور غور کا مادہ بھی موجود ہوتا ہے اور جن کی شخصیت سب

سے زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ حکومت کرنے کا حق اُن ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ اس طرح معاشرے کا پہلا اصول معاشرے کے تین طبقے ہیں اور ہر طبقے کے سپرد وہ کام کیا جانا چاہیے جس کی وہ اہلیت رکھتا ہو۔ اس اصول پر عمل کرکے ہر شخص اپنی سرشت کے مطابق سکون، آسودگی اور اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔"

افلاطون کے نزدیک "ریاست میں کامل ربط اور اتحاد، دانائی، ہمت اور اعتدال کے عناصر کو عدل کے ذریعے ہم آہنگ کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور اگر افراد کمال حاصل کرنا چاہئیں تو انھیں بھی اپنی طبیعتوں میں عدل کے ذریعے توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے۔ ریاست میں کاشتکار اور دستکار جسمانی خواہش، سپاہی ہمت اور محافظ عقل جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ریاست کو چاہیے کہ نچلے طبقے کی ذہنی پرورش اس عقیدے سے کی جائے کہ خدا نے محافظوں کو سونے سے، سپاہیوں کو چاندی سے اور نچلے طبقے کو تانبے سے بنایا ہے اور نچلے طبقے کا فرض ہے کہ وہ انسانیت کے بہتر عنصر کی اطاعت کرے۔ محافظوں اور سپاہیوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ اعلیٰ مرتبے کا حق ادا کر سکیں۔"

افلاطون نے ادب میں موسیقی اور جسمانی نشوونما میں غذا اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی تعلیم کا اضافہ کیا۔ محافظ بننے کے لیے سترہ سال کی عمر کے بعد دس سال تک ریاضیات، ہیئت اور پانچ سال تک فلسفے کی تعلیم ضروری قرار دی۔ محافظوں کے لیے پندرہ سال تک حکومت کرنا لازم قرار دیا۔ محافظوں کی تعلیم کے لیے اس نے اور بہت ساری تجاویز پیش کیں جو اشتمالیت کے نام سے مشہور ہیں۔ اس نے اپنے نظامِ حیات میں کاشتکاروں کو تعلیم سے اور سپاہیوں اور محافظوں کو ان لذتوں سے ناآشنا رہنے پر مجبور کیا جو کاشتکاروں کے حصہ میں آئیں۔ اس نے تعلیم میں مرد اور عورت میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا اور دونوں کے لیے ایک ہی نصاب مرتب کیا۔ اس کے نظامِ حیات میں مرد یا عورت کوئی بھی محافظ بن سکتا ہے۔

افلاطون نے صحت مند اور تندرست اولاد پیدا کرنے کے لیے یہ اصول بنایا

کہ سپاہیوں اور محافظوں کے طبقوں میں سے ان مردوں اور عورتوں کے عارضی نکاح کر دیئے جائیں جو جسمانی اور روحانی خوبیوں کے لحاظ سے شہریوں کے اعلیٰ نمونے ہوں۔ پیدائش کے وقت بچہ ماں سے جدا کر دیا جائے تاکہ کسی ماں کو یہ معلوم نہ ہوسکے کہ اس کا بچہ کون سا ہے۔ اس کے مطابق اس لاعلمی سے ہرماں کی نظر میں وہ تمام بچے جن کی پیدائش کا زمانہ ایک ہوگا یکساں عزیز ہو جائیں گے۔ نکاح صرف عمر' صحت اور طبیعت کے لحاظ سے باہم مناسبت سے ہوگا۔ مرد و عورت کی یک جائی کی اجازت محافظ کی مرضی سے ہوگی اور وہ اولاد جن میں ذرا برابر بھی نقص ہو تلف کر دی جائے گی۔ ریاست کی آبادی میں تناسب سے زیادہ اضافہ اور نکاحوں کی تعداد کو ایک خاص حد تک محدود کرنے کی ذمہ داری محافظوں پر ہوگی۔ شادی کے دس سال بعد تک میاں بیوی کو تجربہ کار عورتوں کی نگرانی میں رکھا جائے گا۔

افلاطون کے نزدیک شہروں بلکہ نوع انسانی کو اپنے مصائب سے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک دنیا میں فلسفی بادشاہ نہ ہوں یا بادشاہوں اور شہزادوں میں فلسفے کی روح اور فلسفے کی قوت نہ آجائے۔ افلاطون کی دوسری تصانیف "مدبر" اور "نوامیس" ہیں۔ مدبر میں فلسفی کی جگہ "مدبر" لے لیتا ہے۔ اس کے نزدیک "مدبر میں فلسفی کی تمام صفات اور عملی علوم پر فضیلت حاصل ہونی چاہیے۔ مدبر کو اپنے ماتحتوں پر کامل اقتدار حاصل ہونا چاہیے۔ اسے قانون کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔"

یونان میں عام طور پر ریاستوں کی پانچ قسمیں بادشاہت' مطلق العنانی بادشاہت' اشرافیہ' چند سری اور جمہوریت مانی جاتی تھیں۔ افلاطون نے ان میں عینی بادشاہت اور بے آئینی جمہوریت کا اضافہ کیا۔ اس کے نزدیک تین طرح کی حکومتیں دستوری بادشاہت' اشرافیہ اور معتدل جمہوریت قانونی ہیں۔ عینی بادشاہت کا درجہ سب سے بلند ہے۔ اس کے بعد بادشاہت ہے جبکہ جمہوریت جبری ریاستوں

میں غنیمت اور قانونی ریاستوں میں سب سے کم تر ہے۔

افلاطون کے نزدیک "ملکیت کا حق سب کا ہے لیکن اس پر ریاست کی نگرانی ہونی چاہیے۔ شہریوں کو جو زمین دی جائے اس کا ایک حصہ شہر کے قریب اور دوسرا حصہ سرحد کے پاس ہونا چاہیے۔ شہریوں کے لیے صرف زراعت ہی کسب معاش کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو زیادہ دولت پیدا کرنے سے روکے اور دست کاری اور تجارت ریاست کی نگرانی میں غیر ملکیوں کے سپرد کرے۔ عورتوں کو سیاسی حقوق کی تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرے اور ہر شخص کو مرضی یا پسند کی شادی کرنے سے روکے۔"

افلاطون کے نزدیک وہ دستور زیادہ پائیدار ہوتا ہے جس میں حکومت کے مختلف اصولوں کی آمیزش ہو اور اس بنا پر جمہوریت کی ایک ایسی آمیزش کا تصور پیش کرتا ہے جس میں دانائی اور آزادی دونوں شامل ہوں۔ اس نے حاکموں کی کارگزاری کی جانچ پڑتال کے لیے محتسبوں کی انجمن اور شہریوں کے اخلاق کی نگرانی کے لیے مجلس شبینہ تجویز کیں۔

افلاطون کے نزدیک "سب سے اہم بات یہ ہے کہ خدا کی وحدت اور اس کی قدرت کاملہ پر یقین رکھا جائے۔ حقیقی اطاعت کے لیے لازمی ہے کہ شہری اپنے قانون کی دل سے قدر کریں اور ان کی مرضی حکومت کی مرضی کے تابع ہو۔ قانون میں اس وقت تک تبدیلی یا ترمیم نہ کی جائے جب تک تمام حاکم، تمام شہری اور تمام غیبی آوازیں اس پر متفق نہ ہوں۔ قانون کے مطابق سزا دینے کا مطلب سزا پانے والے کی نیکی میں اضافہ یا بدی میں کمی ہوتا ہے۔"

نوامیس میں وہ تعلیم کے اصول بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "بچوں کی تعلیم گہوارے سے شروع کرنی چاہیے اور گہوارے سے ہی تعلیم ریاست کی نگرانی میں ہونی چاہیے۔ تین سال کی عمر سے ورزش شروع کی جائے۔ چھ سال کی عمر میں سکول داخل کروایا جائے۔ ہر ضلع میں الگ سکول ہونا چاہیے اور سکولوں کے ساتھ

ورزش گاہیں اور کھیل کے میدان ہونے چاہیں۔ سکول میں چار سال تک ابتدائی تعلیم دی جائے جس میں گھوڑ سواری' تیر اندازی اور نیزہ بازی سکھانا چاہیے۔ دس سال سے تیرہ سال تک ادب اور تیرہ سے سولہ سال تک موسیقی کی تعلیم دینی چاہیے۔ شادی کی اجازت پچیس برس تک نہیں ہونی چاہیے۔"

ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔ وہ بیس سال اکٹھے رہے اس لیے افلاطون کی شخصیت کا اثر اس پر نمایاں نظر آتا ہے۔ قدیم یونان میں سیاست اور معاشرت میں مملکت اور حکومت میں اور معاشرہ اور حکومت میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے انسان کے لیے معاشرتی حیوان کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ ارسطو نے انسان کو سیاسی حیوان قرار دیا اور کہا کہ "تنہا انسان یا تو خدا ہو سکتا ہے یا شیطان جبکہ انسان بحیثیت سیاسی حیوان کے نہ تو خدا ہے اور نہ شیطان۔ اس لیے انسان معاشرتی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔" ارسطو نے اپنی مثالی ریاست کے وجود کے قیام کے لیے طبعی' عقلی اور جغرافیائی حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اس کے تصور آغاز مملکت کے مطابق "بنیادی طور پر آغاز مملکت انسانی فطرت سے ہے اور مملکت کا ارتقا انسانی ضروریات اور اس کی فطری جبلتوں کے تسلسل اور ارتقا کے ساتھ ساتھ ہوا۔ انسان اپنی چند مادی اور اخلاقی ضروریات پورا کرنے کے لیے دوسروں کے تعاون کا طالب ہوتا ہے اور اس تعاون کی ابتدائی شکل خاندان' بہتر شکل گاؤں اور اعلیٰ ترین شکل مملکت ہے۔"

ارسطو کے مطابق "انسانی بقا اور محافظت کی ضرورت کی وجہ سے خاندان وجود میں آیا۔ حیاتیاتی رشتہ' کچھ مادی' جنسی اور اخلاقی ضروریات کے تحت مرد اور عورت میں ملاپ ہوا جو خاندان کی ابتدا کا باعث بنا۔ خاندان کے وسیع ہونے سے ضروریات بھی وسیع ہو جاتی ہیں اور یہ ضروریات باہمی تعاون سے پوری ہوتی ہیں جس سے خاندان مستحکم ہوتا ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعاون فطری اور حیاتیاتی تقاضوں کا متقاضی ہوتا ہے اور انسانی ضروریات کا تعلق انسان کی فطری جبلت سے

ہوتا ہے اس لیے خاندان ایک فطری ادارہ ہے۔ خاندان کی ضروریات کے وسیع ہونے پر چند خاندان مل کر گاؤں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہ گاؤں بہت سارے خاندانوں کی مادی، اخلاقی اور حیاتیاتی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ یہ ادارہ بھی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور اس ادارے کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک منظم و مستحکم اور خود کفیل ادارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہ ادارہ بلاشبہ مملکت ہوتا ہے۔ مملکت بہت سارے گاؤں کا اجتماع ہے جہاں انسان کی تمام تر مادی، حیاتیاتی اور اخلاقی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ ادارہ نہ صرف فرد کی انفرادی زندگی کے جملہ پہلوؤں کی حفاظت کرتا ہے بلکہ مختلف خاندانوں اور گاؤں و قصبوں کے اجتماعی زندگی کے جملہ ضروریات کے علاوہ ان کے مثالی ارتقا کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ مملکت کے آغاز سے متعلقہ دو ابتدائی ادارے خاندان اور گاؤں نامکمل ادارے ہیں جبکہ مملکت انسانی ضروریات کی تکمیل کا واحد فطری ادارہ ہے۔"

ارسطو کے نزدیک "ریاست کل ہے اور افراد اور دیگر تنظیمیں اس کے اجزاء ہیں۔ ریاست تنظیموں کے اجتماع کا نام ہے اور یہ سب سے اعلیٰ تنظیم ہے۔ یہ تنظیم معاشرتی ارتقاء، قدر و مقصد اور افراد کی بہبود کے لیے سب سے بہتر ہے اور انسان کی فطری منزل کا مقصود ہے۔ اس کی بنیاد انصاف کے عنصر پر مبنی ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ افراد کو مکمل اور خودمختار زندگی کی یقین دہانی کرائے، ان کی نیک خصلتوں کو نیک افعال کی صورت اختیار کرنے میں معاونت کرے، افراد کی جبلی ضروریات کو پوری کرے اور افراد کو ذہنی اخلاقی اور جسمانی ارتقا کے حصول کے لیے ذرائع اور مناسب وسائل مہیا کرے۔"

بارکر کے مطابق "ارسطو تاریخی ترتیب کے اعتبار سے فرد کو ریاست سے پہلے اور منطقی لحاظ سے ریاست کو فرد سے پہلے سمجھتا ہے۔" فاسٹر کے مطابق "ارسطو کی مملکت انسانی ارتقا کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہے اور یہ ایک آشیانہ کی مانند

Macilman کے مطابق "ارسطو کی ریاست ایک طرح کی تنظیم ہے جو سب سے بہتر اور اعلیٰ و ارفع ہے۔"

ارسطو نے مملکت کو حکومت کے ہم معنی سمجھ کر کئی اصولوں کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے۔ اس کے مطابق بعض مملکتیں تشکیلی بنیادوں پر اخلاقی مقاصد کی حامل ہوتی ہیں۔ ان میں حکمران طبقہ بے لوث خدمت کا جذبہ رکھتا ہے اور ان کے پیش نظر رعایا کی خدمت اور فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ ان مملکتوں کے مقاصد اخلاقی ہوتے ہیں اور ان میں عوامی فلاح و بہبود اور نیک معاشرتی زندگی کے اصول کار فرما ہوتے ہیں۔ یہ مملکتیں معیاری ہوتی ہیں جبکہ بعض مملکتوں میں اخلاقی مقاصد اور قواعد و ضوابط کے علاوہ دیگر مقاصد کو اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ حکمران طبقہ فلاح و بہبود کی بجائے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں مصروف رہتا ہے۔ ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دی جاتی ہے اور عوامی فلاح و بہبود اور مملکتی مقاصد کو پس انداز کر دیا جاتا ہے ایسی مملکت بگڑی ہوئی مملکت کہلاتی ہے۔

ارسطو مملکت کو حکمران طبقے کی تعداد کی بنیاد پر تقسیم کرتے ہوئے چھ قسم کی حکومتوں کی نسبت سے مملکتوں کی درج ذیل چھ اقسام بیان کرتا ہے۔

1- ایک شخص کی اچھی حکومت بادشاہت Monarchy

2- ایک شخص کی بری حکومت استبدادیت Tyrnny

3- چند اشخاص کی اچھی حکومت اشرافیہ Aristocracy

4- چند اشخاص کی بری حکومت چند سری Oligarchy

5- بہت سے افراد کی اچھی حکومت آئینی حکومت Polity

6- بہت سے افراد کی بری حکومت جمہوریت Democracy

ارسطو ان چھ اقسام کی نسبت سے ممکت کے مقاصد اور حکمران طبقے کے مقاصد کے تحت مملکت کو تین اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔

1- ایک شخص کی جہاں حکمرانی ہو۔

2- چند اشخاص کے پاس سیاسی اقتدار ہو۔

3- بہت سے لوگوں کے پاس سیاسی اقتدار ہو۔

ارسطو کے خیال میں یہ مملکتیں اچھی بھی ہوسکتی ہیں اور بری بھی۔

ارسطو کے نزدیک چند سری حکومت بنیادی طور پر خراب حکومت نہیں ہے بلکہ یہ دولت مندوں کی حکومت ہوتی ہے جو تعداد میں کم اور اپنی نیت اور ارادے میں خودغرض ہوتے ہیں۔ ان کی خودغرضی کی وجہ سے یہ حکومت غیر معیاری ہوتی ہے۔ جمہوریت غریبوں کی حکومت ہوتی ہے جو تعداد میں بہت زیادہ ہوتے ہیں جس کے باعث مملکتی مقاصد کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک بالخصوص اشرافیہ طرز حکومت میں شہریوں کو نیکی کے اصولوں اور اخلاقی اقدار کی بنیاد پر القابات' اعزازات' عہدے اور مراعات دی جاتی ہیں۔ چند سری حکومت محض دولت کی بنیاد پر عہدوں اور مراعات کی تقسیم کرتی ہے جبکہ جمہوریت میں عہدے اور مراعات صرف پیدائش کی بنا پر دیئے جاتے ہیں اور اس میں نیکی یا اطاعت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ جمہوریت میں شہری اہلیت اور قابلیت کی بنیاد پر مقننہ اور عدلیہ کے رکن نہیں بنتے بلکہ پیدائش اور قرعہ اندازی کے ذریعے رکنیت حاصل کرتے ہیں۔

ارسطو کے نزدیک مملکت ایک مرکب اور کل ہے اور اس مرکب اور کل کے لازمی اجزا شہری ہیں۔ وہ شہریت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "ہر وہ شخص جو مملکت کے قانون اور انتظامی معاملات میں شریک ہونے کا حق رکھے وہ مملکت کا شہری ہے۔" اس کے نزدیک شہریت کی لازمی شرط یہ ہے کہ افراد مملکت میں قانونی اور انتظامی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ ان سرگرمیوں اور فرائض کی انجام دہی میں ان سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ افراد مملکت میں عدلیہ اور دیگر انتظامی شعبوں سے متعلق فرائض کی بجا آوری کر کے ہی شہری بن سکتے ہیں اور جو لوگ ایسا نہیں کریں گے وہ شہری کہلانے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ شہری میں حاکم اور محکوم

رہنے کی بیک وقت دونوں صلاحیتیں ہونی چاہئیں اور اسے معمولی روزی کے لیے مصروف کار نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے نزدیک بچوں' بوڑھوں' عورتوں اور ان لوگوں کو جو ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرتے ہیں اور مزدور طبقہ جسے صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا وقت میسر نہیں ہوتا کو شہری بننے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ثانوی شرائط کے طور پر اس کے خیال کے مطابق یونانی شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ ماں اور باپ کی طرف سے یونانی ہو۔ ایتھنز کا مستقل رہائشی ہو۔ اس کی پیدائش یونان میں ہوئی ہو۔ اس کے نزدیک غلام والدین کی اولاد اور غیر یونانی شہری نہیں ہو سکتے۔

ارسطو غلامی کے ادارے کے جائز ہونے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "معاشرت کے دیگر ادارت کی طرح غلامی کا ادارہ بھی مملکت کا ایک جزو ہے جو معاشرے کے عمومی استحکام کے لیے سرگرم عمل ہے۔ انسان صلاحیت کے اعتبار سے پیدائشی طور پر غیر مساوی ہیں۔ آدمی کو چونکہ جبلی طور پر مختلف خصوصیات دی گئی ہیں۔ اس لیے فطرت کا تقاضا ہے کہ تمام انسان ذہنی اور جسمانی طور پر برابر نہ ہوں۔ کچھ لوگ پیدائشی آقا ہیں اور کچھ لوگ پیدائشی محکوم۔ پہلا گروہ ذہنی اعتبار سے اور دوسرا گروہ جسمانی قوت کے لحاظ سے گھریلو زندگی کی قوت ہیں۔ حاکم اور محکوم ہونا فطری عمل ہے اور اس طرح جسم کو روح' اشتہا کو فہم' حیوان کو انسان اور عورت کو مرد کے زیر نگیں رہنا چاہیے۔ آقا روح اور غلام جسم کی مانند ہوتا ہے اور روح کو جسم پر فوقیت حاصل ہے۔ غلام اپنے آقا کے ساتھ رہ کر اپنی شخصیت کو ارتقا بخشتا ہے اور آقا غلام کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔"

ارسطو کے مطابق مملکت ایک فطری ادارہ ہے اور اس کے مختلف اجزا بھی فطری ہو سکتے ہیں۔ معاشرے میں غلام اپنے مالک یا آقا کا آلہ کار ہے اور وہ جاندار آلہ کار کی حیثیت سے اپنے مالکوں کے احکامات کی تکمیل کرتا ہے۔ غلام کی حیثیت محض نجی ملکیت جیسی ہوتی ہے اس لیے آقاؤں کو یہ پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ

اپنی ملکیت کو جس طرح چاہیں استعمال میں لائیں اور جس کے نام چاہیں حقوق ملکیت منتقل کریں۔ غلام گھریلو زندگی کالازمی جزو ہے اور وہ بے عقل ہونے کی وجہ سے رائے اور ارادے میں اپنے آقا کی راہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ غلامی فطری اور اس لحاظ سے عین انصاف کے مطابق ہے کہ انجمنوں' مرکبات اور انسانوں کے درمیان جو تعلقات ہوتے ہیں ان میں کچھ عناصر برتر اور کچھ کم تر ہوتے ہیں اور ان کے درمیان حاکمیت اور محکومیت کا رشتہ بدرجہ اُتم موجود ہوتا ہے۔ معاشرے کی ابتدائی اکائی خاندان ایک مرکب اور انجمن ہے۔ خاندان کے افراد یا اجزا کے درمیان برتری و کمتری کے پہلو اور ان میں اطاعت و فرمانبرداری کا تصور نمایاں ہے۔ بیوی شوہر سے' اولاد والدین سے کمتر ہیں اور غلام ان سب میں سے کمترین ہیں۔

ارسطو کے نزدیک کائنات میں انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوقات میں بھی برتری اور کمتری پائی جاتی ہے۔ اس طرح برتری اور کمتری کا تصور جاری و ساری رہنے والی اور ابدی اور فطری حقیقت ہے۔ غلامی کا ادارہ آقا اور غلام دونوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ آقا کا زیادہ کام غلام کرتا ہے جس سے آقا کو فراغت میسر آتی ہے اور وہ مملکتی امور کی بجا آوری بہتر طور پر کرسکتا ہے جبکہ غلام کے پاس عقل نہیں ہوتی اور وہ اپنی زندگی کو مربوط منظم اور باربط بنانے کے لیے عقلی کاموں کی انجام دہی میں اپنے آقا سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک آقا کی حیثیت روح کی اور غلام کی حیثیت جسم کی سی ہے۔ انسانی جسم پر روح کو اس لیے برتری حاصل ہے کہ جسم روح کی مرضی کے مطابق اعمال و افعال سرانجام دیتا ہے۔ یوں ہی غلام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام تر اعمال و افعال آقا کی مرضی کے مطابق سرانجام دے اسی میں اس کی بھلائی اور فائدہ ہے۔

ارسطو کے نزدیک غلامی کی مدافعت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس

دور میں دنیا کے ہر حصے میں غلامی کا رواج تھا اور غلامی کے ادارے کو قومی اقتصادیات اور استحکام کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ہر یونانی شہری ریاست میں بے شمار غلام ہوتے تھے اس ادارہ کو ختم کرنے سے ایتھنز کا سیاسی نظام نہ صرف غیر متوازن ہو جاتا بلکہ سارا معاشرتی ڈھانچہ متزلزل ہو جاتا۔ اس لیے ارسطو غلامی کے ادارہ کی چند خاص شرائط پر مدافعت کرتا ہے جو اس طرح ہیں۔

1۔ پیدائشی غلام اور قانونی غلام میں امتیاز ہونا چاہیے۔ جنگی قیدی قانونی غلام تصور کیے جائیں گے۔

2۔ قانون کے بل بوتے پر غلام نہیں بنائے جانے چاہئیں۔

3۔ آقا کو غلام کے ساتھ بدسلوکی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے۔

4۔ تمام غلاموں کو آزادی کی امید دلانی چاہیے اور انہیں آزادی حاصل کرنے کا اور آزادی کے قابل خود کو ثابت کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

5۔ جنگی قیدیوں اور قانونی غلاموں کو اس وقت غلام قرار دینا چاہیے جب مفتوح لوگ فاتحین سے ذہنی طور پر پست ہوں۔

ارسطو کے نزدیک کم و بیش ہر مملکت میں سیاسی عدم استحکام رہتا ہے جس کی وجہ سے عمومی معاشرتی صورت حال بدتر ہو جاتی ہے۔ جس کے لیے انقلاب ناگزیر ہے۔ اس کے خیال میں عدم مساوات کا احساس' معاشی ناہمواری' سیاسی جانبداری' متوسط طبقے کا نہ ہونا اور انتہا پسند نظریات انقلابات کا باعث بنتے ہیں۔

ارسطو کے خیال میں انقلاب کی پہلی اور اہم وجہ عدم مساوات کا احساس ہے اور یہ احساس مختلف لوگوں میں مختلف انداز میں ابھرتا ہے۔ لوگوں میں اتفاق رائے موجود نہ ہونے کے باوجود بھی عدم مساوات کا احساس موجود ہوتا ہے۔ جو مملکتیں مطلق مساوات کی بنیاد پر استوار ہوں وہاں اہلیت کو مساوات کا معیار بنانے کا مطالبہ ابھرتا ہے جسے تسلیم نہ کرنے پر عوام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کئی مملکتوں میں

معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے اور وہاں اہلیت کی مساوات کے خلاف مطلق مساوات کا مطالبہ کرنے والے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ارسطو کی نظر میں انقلاب کی دوسری اہم وجہ معاشری ناہمواری اور ملکیت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ اگر معاشرے میں معاشی تفاوت امیر اور غریب کے فرق کو خوب نمایاں کرے تو حالات دگرگوں ہو جاتے ہیں اور بالآخر معاشی نظام میں تبدیلی رُونما ہو جاتی ہے۔ ارسطو کی نظر میں تیسری اہم وجہ جس کے باعث انقلاب آتا ہے سیاسی جانب داری ہے جب کوئی حکومت یا برسر اقتدار طبقہ بدعنوانیوں میں ملوث ہو کر ظلم و زیادتی کے قوانین بنائے اور عوام کی خواہشات و فلاح و بہبود کا خیال نہ رکھے تو عوام حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انقلاب آنے کی چوتھی وجہ متوسط طبقے کا نہ ہونا بتائی گئی ہے۔ ارسطو کے مطابق اَپر اور لور کلاس طبقات میں مراعات کے لحاظ سے تصادم پیدا ہوتا ہے۔ جو معاشرے میں عدم استحکام پیدا کرتا ہے۔ اس لیے معاشرہ کے استحکام کے لیے متوسط طبقے کا ہونا لازمی ہے اس کے نزدیک متوسط طبقہ ہی معاشرے کو متوازن رکھتا ہے۔ ارسطو انقلاب کی پانچویں اور آخری وجہ انتہاپسندانہ نظریات کو قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "اگر کسی معاشرے میں افراد یا طبقے انتہاپسندانہ نظریات کے حامل ہوں تو معاشرہ عدم استحکام کا شکار ہو جاتا ہے اور نظریاتی انتہا پسندی ہمیشہ تصادم کی طرف لے جاتی ہے۔" اس کے نزدیک بغاوت اور انقلاب کا اصل سبب مساوی حقوق کی خواہش اور اصل سیاسی قوت جو مختلف طبقات کے پاس ہوتی ہے کا باہمی تضاد ہے۔ دوسرے اسباب میں حصول کی محبت، اعزاز کی محبت، غیر شائستگی، خوف، انتخابی سازشیں، وفا ناشناسی، لوگوں کو حکومتی عہدے دیتے وقت احتیاط نہ کرنا، معمولی تغیرات اور ریاست کے مختلف عناصر کے اختلاف کو نظر انداز کرنا ہیں۔ اس کے مطابق انقلاب کی درجہ ذیل عمومی اقسام ہیں۔

1- مکمل انقلاب Complete Revolution

| | |
|---|---|
| 2- نامکمل انقلاب | Un-Complete Revolution |
| 3- خونی انقلاب | Blood Revolution |
| 4- آئینی انقلاب | Constitutional Revolution |
| 5- شخصی انقلاب | Personal Revolution |
| 6- غیر شخصی انقلاب | Un-personal Revolution |
| 7- طبقاتی انقلاب | Classified Revolution |
| 8- بے مقصد انقلاب | Aimles Revolution |

ارسطو کے نزدیک مکمل انقلاب وہ ہوتا ہے جو کسی بھی معاشرے کے عمومی، سماجی اور سیاسی نظام کے بنیادی ڈھانچے کے علاوہ اس کے اساسی اصولوں میں تبدیلی لانے کا باعث بنے۔ (دور حاضر میں 1917ء کا انقلاب روس اس کی ایک مثال ہے) نامکمل انقلاب سے مراد ایسا انقلاب ہے جس میں صرف ایک ہی چیز تبدیل کی جائے یعنی سیاسی نظام کے بنیادی اصولوں، معاشرتی و معاشی نظام کے بنیادی ڈھانچے یا پھر حکومت میں سے کسی ایک کو تبدیل کرتے ہوئے سیاسی و سماجی نظام کو بدستور قائم و دائم رکھا جائے۔ (جیسے دور جدید میں ایران کے انقلابی گروہ نے حکمران طبقے کو تبدیل کیا تھا۔)

ارسطو کے نزدیک خونی انقلاب مکمل بھی ہوسکتے ہیں اور نامکمل بھی لیکن ہر دو صورتوں میں تبدیلی کے عمل کے لئے مملکت میں خون خرابہ ہوتا ہے اور اسے ہی خونی انقلاب کہا جاتا ہے۔ (دنیا کے تینوں انقلاب، انقلاب فرانس، انقلاب روس اور انقلاب ایران میں سے کچھ مکمل اور کچھ نامکمل ہیں لیکن قتل و غارت گری ہر ایک میں ہوئی ہے)

اس کے نزدیک آئینی طریقہ کار کے مطابق الیکشن کے ذریعے اپنی اکثریت کی بنیاد پر برسراقتدار طبقے سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے یا اسمبلی کے اندر انقلابی آئینی طریقہ کار کے مطابق بغیر کسی بڑے بحران کے اقتدار حاصل کرنے کو آئینی

انقلاب کہلاتا ہے۔

اس کے نزدیک شخصی انقلاب صرف مقتدر اعلیٰ کی تبدیلی تک محدود ہوتے ہیں جبکہ عمومی سیاسی نظام اور دیگر سماجی نظام کے ساختی عناصر برقرار رہتے ہیں۔ جبکہ غیر شخصی انقلاب وہ انقلاب ہے جس میں سیاسی نظام کے اصولوں اور ضابطوں کے علاوہ پورے معاشرتی ڈھانچے کے ساختی عناصر اور ان کے جملہ قاعدوں کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

ارسطو کے مطابق طبقاتی انقلاب سے مراد محض برسرِاقتدار طبقات کی تبدیلی ہوتی ہے۔ چند سری حکومت جو درحقیقت دولتمندوں کی حکومت ہوتی ہے۔ اشرافیہ کی بگڑی شکل ہے۔ اس لیے اگر غریب طبقہ اس کو ختم کر دے تو یہ طبقاتی انقلاب ہوگا۔ اس قسم کے انقلاب کا بظاہر کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ شعلہ بیاں مقرر اپنی شعلہ بیانی سے لوگوں کو حکومت کے خلاف اُکسا کر ذاتی طور پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو یہ انقلاب بے مقصد انقلاب ہوگا۔

ارسطو اس قسم کے انقلاب کے سدباب کے لیے ٹھوس تجاویز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "مملکت میں صحیح تصور مساوات موجود ہونا چاہیے۔ مساوات کا طریقہ درست اور دیرپا ہے لہٰذا اہلیتی مساوات کو عملاً نافذ ہونا چاہیے جس سے سیاسی عدم استحکام رُک جاتا ہے۔ ذاتی ملکیت اس شرط کے ساتھ ہونی چاہیے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ حاصل کریں۔" اس طرح ارسطو ملکیت کا محدود تصور پیش کرکے دراصل زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچا کر اور معاشی تفاوت دُور کرکے معاشی عنصر سے معاشرے کے ہر فرد کو مستفید دیکھنا چاہتا ہے اس کے خیال میں سیاسی عدم استحکام کی ایک اور بنیادی وجہ سیاسی بدعنوانیاں ہے۔ اس کے نزدیک اس قسم کی صورت حال پر کنٹرول رکھنے کے لیے افسرانِ بالا اور حکمرانوں پر کڑی نگرانی رکھنی چاہیے تاکہ وہ مملکتی مقاصد کے مطابق انصاف سے کام کریں۔

' اقربا پروری اور دوسری سیاسی بدعنوانیوں سے دور رہیں اور حساب و کتاب صاف ستھرے رکھیں۔ اس کے خیال میں انقلاب کو روکنے کے لیے نظام تعلیم' سیاسی' معاشرتی اور معاشی نظام و دیگر نظریات کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ضروری ہے۔ تعلیم ہی سے انصاف کی تکمیل اور فرائض کی صحیح طور پر بجا آوری ممکن ہے اور معاشرتی نظام کی بقا کے لیے صحیح نظام تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ ارسطو کے نزدیک انقلاب کے سدباب کے لیے متوسط طبقے کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اس کے خیال میں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقے انتہا پسند ہوتے ہیں اور کسی مشترکہ نقطہ نظر پر متفق نہیں ہوسکتے اس لیے ایسا متوسطہ طبقہ موجود ہونا چاہیے جو ان دونوں میں صلح کروا سکے۔ اس کے خیال میں مملکت کا آئین مخلوط عناصر پر مبنی ہونا چاہیے تاکہ معاشرہ سے انتہا پسندی ختم ہوسکے۔

ارسطو اپنے تصور تعلیم میں کہتا ہے کہ "انسان کی جسمانی اور ذہنی نشوونما تعلیم کے ذریعے ہوتی ہے اور معاشرے کے افراد کے لیے ایسی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیے جس سے نہ صرف وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں بلکہ مملکتی مقاصد کی تکمیل بھی کرسکیں۔" انسان کو جسم اور روح کا مجموعہ قرار دیتے ہوئے ارسطو انسانی عقل کو عقلِ انفعالی جس کا تعلق براہِ راست جسم سے ہوتا ہے اور عقلِ فعالی میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے خیال میں جسم کی نشوونما اور بہترین تربیت کے لیے تعلیم' ورزش اور مختلف کھیل ہیں۔ بچوں کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ اخلاقی نشوونما بھی ہونی چاہیے۔ اخلاقی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ موسیقی جو انسانی دل اور دماغ پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے کی تعلیم دی جائے۔

ارسطو کے نزدیک عقل فعالی کی نشوونما اور دماغ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لیے بچوں کی' ان کی نفسیات کے مطابق' خالصتاً" فلسفیانہ مضامین جن میں مابعد الطبیعیات' علم ہندسہ' طبعی تاریخ' طبیعات' ریاضی' حیاتیات' علم نجوم' منطق اور جمالیات پڑھانے چاہیں۔ جس سے نہ صرف انفرادی بلکہ مملکتی فوائد بھی

حاصل ہو سکیں گے۔

ارسطو کے نزدیک تعلیم کا اہم اور کلیدی مقصد افراد کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ تعلیم انسانی ذہن کی لامحدود صلاحیتوں اور اسرار و رموز کو عملی شکل دینے کے لیے بنیادی محرک کی حیثیت رکھتی ہے اور تعلیم ہی کے ذریعے فرد کی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم کا دوسرا بڑا مقصد معاشرے میں اخلاقی اقدار کا فروغ ہے۔ اور یہ مقصد صرف تعلیم ہی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مزید تعلیم کے ذریعے ایک اخلاقی اور نیک زندگی کا حصول بھی ممکن ہے۔ تعلیم کا تیسرا بڑا مقصد انسانی سیرت کی نشوونما ہے اور اسی کے ذریعے افراد کی دنیاوی زندگی کو بہترین اخلاقی اصولوں میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ تعلیم سے ہی افراد "عمل" جس کا دوسرا نام "پُرمسرت اور نیک زندگی ہے" کرنا سیکھتے ہیں۔ تعلیم سے ہی عمدہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے ذریعے افراد میں نیکی کو ابھارنے اور بدی کو ترک کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی مملکتی مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور اسی کے ذریعے حقیقت تک رسائی ممکن ہے۔

ارسطو کے خیال میں ہر مملکت کو چاہیے کہ وہ تعلیمی نصاب وضع کرتے وقت مقاصد' افراد کے ذہنی رجحانات' طرز زندگی' ضروریات' معاشرہ اور دیگر عناصر کو مدنظر رکھے۔ بچے کی پیدائش سے لے کر مابعد کے ادوار تک ہر دور میں بچے کی ذہنی حالت مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا بچے کو تعلیم ان کی ذہنی حالتوں کو مدنظر رکھ کر دینی چاہیے۔ ارسطو نے اپنے نظام تعلیم میں بچے کو تعلیم دینے کے لیے عمر کے حساب سے مختلف سطحیں مقرر کی ہیں جو اس طرح ہیں۔

## الف۔ قبل از ابتدائی تعلیم

ارسطو کے خیال میں ابتدائی تعلیم کا عرصہ پیدائش سے پانچ سال تک کی عمر کا

ہے۔ یہ دور بچوں کی نشوونما کے لیے بہت اہم ہے۔ اس دور میں بچے میں عقل برائے نام ہوتی ہے اس لیے والدین کو چاہیے کہ وہ بچے کو ایسی باتیں سکھائیں جو اس کے مشاہدہ کے قریب تر ہوں۔ بچے کو یہ تعلیم والدین کو اپنے گھر میں دینی چاہیے جو ورزش اور مختلف قسم کے ہلکے پھلکے کھیلوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ مزید والدین کو چاہیے کہ وہ بچے کے جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے طریقے اپنائیں کیونکہ ایک توانا جسم میں ہی توانا دماغ پرورش پاتا ہے۔

## ب۔ ابتدائی تعلیم

ارسطو کے خیال میں ابتدائی تعلیم کے لیے پانچ سال سے سات سال کی عمر موزوں ہے۔ یہ تعلیم گھر میں ہی والدین کو خود دینی چاہیے۔ البتہ کبھی کبھار سرکاری معلمین کو معائنہ کرنا چاہیے تاکہ اگر بچے کی نشوونما میں والدین سے کوتاہی ہو رہی ہو تو سرکاری معلمین والدین کو وہ اصول بتائیں جن پر عمل کر کے بچے کی بہترین نشوونما اور بالیدگی ممکن ہو سکتی ہو۔ ارسطو کے مطابق اس دور میں والدین کو چاہیے کہ وہ ہر وہ طریقہ آزمائیں جن سے بچے کی خوابیدہ صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں۔

## ج۔ پرائمری تعلیم

ارسطو کے نظام تعلیم میں پرائمری تعلیم کی سطح 7 سے 14 سال تک کی عمر ہے اور یہی سطح اُس کے نزدیک زیادہ اہم ہے۔ ارسطو کے خیال کے مطابق ابتدائی تعلیم کے بعد بچّے میں اچھائی اور برائی کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اردگرد کے ماحول اور چیزوں کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے لہٰذا بچے کو سات سال کی عمر پوری ہوتے ہی

سکول بھیجنا چاہیے اور سکول میں اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچے کی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم دیں بچے کی نفسیات اور اس کے طبعی میلانات کو سامنے رکھ کر اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کریں اور اس کے ذہن پر جو اس وقت کورے کاغذ کی مانند ہوتا ہے بہترین تربیت رقم کریں۔

اس دور میں جسمانی نشوونما کے لیے ورزش' کھیل اور دوسرے ذرائع استعمال کرنے چاہیں اور ذہنی نشوونما کے لیے موسیقی اور ریاضی سکھانی چاہیے۔ اس کے خیال میں موسیقی سے نہ صرف روحانی اور ذہنی تربیت ہوگی بلکہ بچوں کا اخلاق درست ہوگا اور جمالیاتی شعور پیدا ہوگا۔ جبکہ ریاضی سے بچے کے دماغ کی خوابیدہ صلاحیت بیدار ہوگی۔

## د۔ ثانوی تعلیم

ارسطو اپنے نظام تعلیم میں 14 سے 21 سال تک کی عمر کا عرصہ ثانوی تعلیم کے لیے مقرر کرتا ہے۔ اس کے خیال میں اس عرصے میں بچے شعور کو پہنچ جاتے ہیں لہٰذا اس سطح پر تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ ان کی جسمانی' ذہنی اور اخلاقی نشوونما میں ایک توازن پیدا ہوسکے۔ مملکت کو اس دور کی تعلیم اپنی نگرانی میں دینی چاہیے تاکہ اس دور کی تعلیم مکمل کرکے افراد مملکتی امور میں برائے راست حصہ لے سکیں۔

اس سطح پر بچوں کو علم ریاضی' علم ہندسہ' علم نجوم' قانون' اخلاقیات' ادب' فن تقریر' فلسفہ اور سیاسیات کی تعلیم دی جانی ضروری ہے تاکہ طلبہ فطرت کو سمجھنے اور بہترین زندگی گزارنے کے اہل بن سکیں۔ طلباء کی ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور جسمانی نشوونما بھی ضروری ہے جس کے لیے فلسفہ' سائنس' ادب' نفسیات اور سیاسیات جیسے مضامین مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

## ر۔ اعلیٰ تعلیم

ارسطو کے نظام تعلیم میں اعلیٰ تعلیم کی عمر 21 سال سے بعد کی ہے۔ چونکہ اس سطح پر پہنچنے والے لوگ محنتی اور ذہین ہوتے ہیں لہٰذا مملکت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی مناسب تعلیم و تربیت کرے۔ یہ دور صرف ذہنی تعلیم و تربیت کے لیے مخصوص ہونا چاہیے اور اس دور میں طلبہ کو ایسے مضامین کی تعلیم دینی چاہیے جن سے ان کی ذہنی صلاحیتیں زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوں۔

ارسطو اس سطح کی تعلیم کے نصاب کے لیے علم طبیعات' حیاتیات' نفسیات' فلسفہ' الٰہیات' منطق اور مابعد الطبیعیات ضروری قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "ان علوم کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور فطری قوانین اور فطری اسرار و رموز کو سمجھا جاسکتا ہے۔" وہ ان مضامین کی تعلیم کے لیے استقراری طریقہ مطالعہ کو ضروری قرار دیتا ہے۔

ارسطو اپنے نظام تعلیم میں تعلیم نجی ہاتھوں میں دینے کی بجائے مملکتی کنٹرول میں رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے نزدیک "افراد ایک مثالی زندگی اسی وقت گزار سکتے ہیں جب وہ تعلیم سے بہرہ ور ہوں۔ تعلیم مملکتی مقاصد کی تکمیل کا اہم ذریعہ ہے لہٰذا مملکت کو چاہیے کہ وہ تعلیمی نصاب مملکتی ضروریات اور مقاصد کے تحت تیار کرے تاکہ اچھے شہری پیدا ہوسکیں۔" ارسطو اپنے نظام تعلیم میں والدین کو ابتدائی معلمین کا درجہ دیتے ہوئے تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے' بچے کے پیدا ہوتے ہی' اس کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کی طرف بھرپور توجہ دیں۔ اس نے اپنے نظام تعلیم میں نفسیات کو تعلیم کی بنیاد قرار دیا اور کہا کہ "تعلیم وہی بامقصد ہوسکتی ہے جو بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر دی جائے اور بچوں کے طبعی میلانات اور رجحانات کو سامنے رکھ کر ایسے مضامین پڑھائے جائیں جو ان کی

دلچسپی کا باعث ہوں۔" ارسطو نے اپنے نظام تعلیم میں تحقیق کو بنیاد بنایا اور کہا کہ " تعلیم کی بنیاد تحقیق اور مشاہدات پر ہونی چاہیے۔" اس نے علوم کے مطالعہ کے لیے استقراری طریقے کا استعمال کر کے سائنسی تعلیم کی بنیاد رکھی اور اس کے یہی اصول جدید دنیا کے لیے راہنما اصول بنے۔ ارسطو اپنے نظام تعلیم میں صرف مثالی شہری کو تعلیم دینے پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "غلام طبقے کے لیے تعلیم اس لیے ضروری نہیں کہ ان کا پیشہ تعلیم و تربیت کے لیے موزوں نہیں اور ان کے پاس عقل بھی نہیں ہوتی۔" ارسطو عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں نہیں ہے اس کے خیال کے مطابق مرد عورت پر حکمرانی کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے اور عورتوں کو ان کے دائرہ کار کو سامنے رکھ کر تھوڑی بہت تعلیم دی جانی چاہیے تاکہ اچھی مائیں اور اچھی بیویاں بن سکیں اور امور خانہ داری کو بہتر طور پر چلا سکیں۔

ارسطو کا نظریہ انصاف کامل اخلاقی اچھائی اور کردار کی پاکیزگی سے متشابہہ ہے اور معاشرتی و قومی تعلقات میں اخلاقی اچھائی کا مجموعہ ہے۔ اس کے خیال میں " انصاف کامل ان لوگوں میں موجود ہوتا ہے جو خود کفالت کے پیش نظر اور آزادی مساوات کے حصول کی خاطر ایک مشترکہ زندگی میں منسلک ہیں۔ انصاف کامل قانون سے ہم آہنگی رکھنے میں مضمر ہے۔ یہ انسانی عمر میں پائی جانے والی نیکی ہے۔" ارسطو کے نزدیک انصاف کی دو قسمیں ہیں۔ "تقسیمی انصاف" اور "اصلاح کن انصاف"۔ پہلا انصاف فرد کو معاشرہ کا رکن ہونے کی وجہ سے اس کا حق دیتا ہے جس کا مقصد ہر فرد کو اس کی اہلیت و قابلیت کے اعتبار سے صلہ دینا ہے۔ معاشرہ کے ہر فرد کا حق ہے کہ وہ ریاستی سرگرمیوں میں حصہ لے۔ ریاستی عہدوں پر تقسیم غیر جانبدار ہونی چاہیے کسی شخص کو غیر موزوں طریقہ سے عہدہ پر متعین نہیں کرنا چاہیے۔ عہدوں کا حصول سب کے لیے کھلا ہونا چاہیے کسی طبقہ کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے اور امیر و غریب کو ریاستی امور میں حصہ لینے کے برابر مواقع فراہم ہونے چاہیں۔" ارسطو کے نزدیک اصلاح کن انصاف ایک منفی انداز فکر

ہے۔ اس کا بڑا مقصد ایک شخص کو دوسرے کے خلاف حق دلانا اور گمشدہ مساوات کا اعادہ کرنا ہے۔

ارسطو کے نزدیک جائیداد گھریلو زندگی کے وجود' مناسب کارکردگی اور شخصیت کے نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ یہ فرد کو خود سے محبت کرنا سکھاتی ہے اور معاشرتی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ جائیداد رکھنے والا ریاست سے مخلص ہوگا۔ ریاست کے معاملات میں گرمجوشی سے حصہ لے گا' ٹیکس ادا کرے گا اور ریاست سے بہتر صلہ کی توقع رکھے گا۔ وہ ریاست کے بجٹ میں بھی دلچسپی رکھے گا۔ وہ اپنی جائیداد کے بہتر انتظام میں دلچسپی لے گا جس سے اس کے اندر ریاستی انتظام کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ اس کے خیال میں جائیداد رکھنے اور اس کے استعمال کے لیے ضروری ہے کہ (i) جائیداد فرد کی ذاتی ملکیت ہو مگر منفعت میں سب شریک ہوں۔ (ii) جائیداد پر حق مشترکہ ہو لیکن ماحصل ذاتی طور پر استعمال کیا جائے۔ اور (iii) جائیداد پر حق ملکیت اور حق منفعت دونوں مشترکہ ہوں ان طریقوں میں "حق ملکیت ذاتی ہو مگر منفعت میں سب شریک ہوں" بہترین طریقہ ہے۔

ارسطو کے نزدیک جائیداد اور کنبہ کے بغیر کسی معاشرہ کا تصور ممکن نہیں' اگر جائیداد صرف ذریعہ معاش و رہائش کے معنی میں لیا جائے تو یہ ایک ایسی شے ہے جو فطرت خود ہر حالت میں سب کو عطا کرتی ہے۔ جائیداد دراصل گھریلو زندگی یا ریاست میں ہونے والے آلات کا مجموعہ ہے۔ اس کے نزدیک جائیداد کی دو قسمیں منقولہ اور غیر منقولہ ہیں۔ جائیداد ذاتی بھی ہوتی ہے اور عوامی بھی۔ ذاتی ملکیت کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ اس کا تحفظ ریاست کا کام ہے ورنہ اس پر دوسرے قبضہ کرلیں گے۔

ارسطو کے نزدیک بہتر زندگی کے حصول کے لیے دولت کا ہونا ضروری ہے۔ دولت سے ہی فیاضی' مہمان نوازی اور دوستی جیسی اقدار کا اظہار ہوتا ہے۔ ذاتی املاک معاشرتی اقتصادیات کا لازمی جزو ہے۔ جب ہر آدمی کا اپنا واضح نصب العین

ہوگا تو لوگ زیادہ ترقی کریں گے۔ حصول زر کا مقصد اخلاقی ہے اور ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ اتنی دولت ضرور حاصل کرے جو اس کی بہتر اور خوشحال زندگی کی ضمانت بنے۔ اس کے نزدیک دولت حاصل کرنے کے جائز طریقے وہ ہیں جن کی بدولت شہری زیادہ سے زیادہ ضروریات زندگی حاصل کرتا ہے۔ ان جائز ذرائع میں زراعت، مویشی پالنا اور شکار کرنا شامل ہیں۔ اس کے خیال میں تجارت ایک ناجائز اور غیر فطری ذریعہ ہے کیونکہ تجارت کا حتمی مقصد حصول زر ہے۔

جدید ماہرین کا خیال ہے کہ ارسطو کے تصور آغاز مملکت میں اقتدار اعلیٰ جو مملکت کا استحکام اور بقا کی اہم ضرورت ہے کا کسی بھی سطح پر تصور موجود نہیں ہے اور نہ ہی اقتدار اعلیٰ کی طرح مملکت کے دیگر لازمی عناصر حکومت اور علاقے کا ذکر ہے حالانکہ مملکت کی تشکیل میں اقتدار اعلیٰ کی طرح علاقہ اور حکومت کو اولین اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ارسطو نے اپنے ان نظریات میں ملکیت کے ذکر کے ساتھ ان عناصر کا ذکر نہیں کیا ہے جو ملکیت کی غیر منصفانہ تقسیم کا سبب بنتے ہیں اس نے استقراری طریقہ مطالعہ کی بجائے استخراجی اور مقصدی طریقہ ہائے مطالعہ استعمال کیا اور وہ منزل کی اس حد تک پہنچنے میں ناکام رہا جہاں وہ پہنچنا چاہتا تھا۔ پروفیسر گارنر کے خیال میں "ارسطو کے تصور تقسیم مملکت میں برسر اقتدار طبقے کا اصول موزوں اور مناسب نہیں اس اصول کے اطلاق سے مملکت کی ماہیت اور نوعیت کا اندازہ نہیں ہوتا صرف تعداد کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا یہ تصور صرف شہری مملکت کے لیے ہی موزوں ہے۔ ارسطو نے اپنے اس تصور میں ان وفاقی نظام کے اصولوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے جو قدیم یونان کی بہت ساری مملکتوں میں رائج تھے۔ آج کل حکومتیں زیادہ تر مخلوط نوعیت کی ہوتی ہیں اس لیے اس کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ حکومتوں کی نسبت سے مملکتیں صرف ایک ہی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اس طرح اس تصور کو مکمل طور پر نافذ نہیں کیا جاسکتا اور اگر اس کا عملی اطلاق کیا جائے تو بہت ساری دشواریاں پیدا ہوسکتی ہیں" اس کے ان نظریات میں عاملہ اور مقننہ کے

درمیان تعلق یا مملکت پارلیمانی یا صدارتی طرز حکومت یا پھر وحدانی اور وفاقی طرز مملکت کا ذکر موجود نہیں ہے۔ جدید ماہرین کی نظر میں ارسطو کا یہ کہنا کہ شہری مملکت کے لازمی جزو ہیں اس کی اپنی ذہنی اختراع نہیں ہے بلکہ یہ تصور یونانی سیاسی و سماجی زندگی کا ایک مروجہ طریقہ تھا اور ارسطو نے جو شہریت کی تعریف کی ہے اور جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ ایتھنز کی مروجہ نظام سے مستعار لی ہیں۔ یہ تصور نہ صرف ایتھنز میں بلکہ اسپارٹا بھی رائج تھا۔ اس کے تصور شہریت سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ وہ صرف مراعات یافتہ فارغ لوگوں کو شہری سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں معاشی تگ و دو میں مصروف لوگ شہری نہیں ہیں۔ ارسطو کا تصور شہریت اخلاقی زیادہ اور قانونی کم ہے جبکہ موجودہ عہد میں مملکتی مسائل کا حل اور اُور اک کی تشکیل قانونی جواز کے تحت اور اصولوں کے مطابق ہوتی ہے۔ ارسطو کے نظریات کے تحت شہریت ایک مخصوص اکثریتی طبقہ ہے۔ اس لیے تعداد اور مقدار کے لحاظ سے جدید تصور شہریت زیادہ بہتر ہے۔ ارسطو کا تصور شہریت اشرافی ہے جبکہ جدید شہریت جمہوری ہے۔ اس کے نزدیک اصل شہریوں کی مادی ضروریات کی تکمیل اس معاشی طبقہ کو کرنی چاہیے جو خود شہریت سے محروم ہے جبکہ جدید تصور کے مطابق مملکت کا ہر طبقہ شہری ہے۔

جدید ماہرین کے مطابق ارسطو کا تصور غلامی انسانی اقدار جو کسی بھی مہذب معاشرے کی بنیاد ہوتی ہے سے متصادم ہے۔ ارسطو ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک طرف غلامی کو جائز اور فطری اور دوسری جانب غلاموں کو عام انسانوں سے کم تر اور عقل اور ارادے سے عاری قرار دیتا ہے۔ وہ ایک قدامت پسند مفکر کی طرح غلامی کو جائز، غلام کو نجی ملکیت، عقل اور روح سے عاری اور محض جسم اور جائیداد خیال کرکے انسانیت کے ہمہ گیر اصولوں کی نفی کرتا ہے۔ ارسطو کے تصور غلامی میں منطقی تضادات موجود ہیں جن میں پہلا منطقی تضاد یہ ہے کہ وہ غلامی کو فطری اور انصاف پر مبنی قرار دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غلام کو

ہمیشہ غلام ہی رہنا چاہیے۔ اگر غلام پیدا ہوا تو غلام کی حیثیت سے ہی مرنا چاہیے لیکن دوسری جانب اپنی تصنیف سیاسیات میں غلاموں کی آزادی کا ترجمان نظر آتا ہے۔ اس طرح اس کے تصور میں متضاد آراء موجود ہیں۔ تنقید نگاروں کے نزدیک فطری چیز ہمیشہ فطری رہتی ہے اور جو غیر فطری ہے وہ فطری نہیں رہتی۔

ارسطو کے تصور غلامی میں دوسرا منطقی تضاد یہ ہے کہ وہ ایک جانب تو غلاموں میں عقل سے عاری سمجھتا ہے لیکن دوسری جانب کہتا ہے کہ غلاموں کے پاس عقل تو ہوسکتی ہے لیکن وہ اتنی پختہ نہیں ہوسکتی جتنی کہ آقاؤں کی ہوتی ہے اور اگر انہیں آزاد کردیا جائے تو وہ عاقل بن جاتا ہے۔ یہ تینوں باتیں ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔

ارسطو ایک جگہ آقا کو برتر اور غلام کو مکمل طور پر کم تر سمجھتا ہے اور دوسری جگہ کہتا ہے کہ غلام آقا کا دوست بھی ہوسکتا ہے اور وہ آقا سے معاہدہ بھی کرسکتا ہے جبکہ برتری اور کمتری کی بنا پر دوستی ممکن نہیں ہوتی۔ مزید معاہدہ کی موزونیت کا دارومدار فریقین کے ایک سطح پر ہوتا ہے۔

جدید ماہرین تعلیم کے مطابق ارسطو کا نظام تعلیم طبقاتی ہے وہ ایک مخصوص طبقہ کے لیے تعلیم ضروری سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں تعلیم اعلی و ارفع طبقہ کے لیے ہے اس کے تمام تصورات تعلیم افلاطون کے تصورات سے اخذ کئے گئے ہیں اس لیے اس میں کوئی نیاپن نہیں ہے۔ اس نے انسانی عقل کی جو درجہ بندی کی ہے وہ اس لحاظ سے مناسب نہیں ہے کہ فطرتاً" انسان ہر لحاظ سے اور ہر زاویے سے تقریباً برابر ہوتے ہیں البتہ عقل میں کمی بیشی ہوسکتی ہے جس کو ناپنے کے لیے آج تک کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا۔ اس کے نظام تعلیم میں غلاموں کی تعلیم کا کوئی نظام موجود نہیں بلکہ وہ انہیں عقل سے عاری قرار دیتا ہے۔ اس کے نظام تعلیم میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کمتر ظاہر کرکے واجبی تعلیم دینے کی تلقین کی گئی ہے حالانکہ بنیادی طور پر تجربات اور مشاہدات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ

عورتیں کسی بھی لحاظ سے مردوں سے پیچھے نہیں ہیں موجودہ دور میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ ہر میدان میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں اور تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر بڑی تبدیلی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

موجودہ ماہرین کی متذکرہ تنقید موجودہ حالات کے مطابق درست ہے لیکن ارسطو اس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی معاشرتی اور سیاسی زندگی کے ارتقاء کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا اور اس کے فکر و عمل میں اتنی وسعت پیدا نہیں ہوئی تھی جتنی کہ آج ہے لہٰذا اس کے نظریات دور جدید کے تقاضوں کے عین مطابق نہیں ہوسکتے تھے۔ لیکن پھر بھی اس نے فلسفہ حقیقت کی روشنی میں ایسے اصول وضع کئے ہیں جن کی اہمیت و افادیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آیئے ارسطو کے نظریات و تعلیمات پر اس طرح اختصار سے ذکر کرتے ہیں کہ قاری نہ صرف ان سے لطف اندوز ہو بلکہ اسے ذہن نشین بھی کرسکے۔

# نظریات و تعلیمات ارسطو

- میٹافزکس (Meta Physics) ہی سب سے اہم سائنس ہے۔
- Zoology کے قوانین کا تعلق صرف جانوروں کے وجود اور ان کی زندگی سے ہے لیکن فرسٹ فلاسفی کے اصولوں کا تعلق ہر مادی چیز سے ہے۔
- آفاقی تصورات فطرت کی دائمی اشیاء کے سوا کچھ نہیں۔
- ہر چیز کا آفاقی تصور اس چیز کی ذات کے حوالے سے ہے۔
- اگرچہ آفاقیت حتمی سچائی ہے لیکن یہ انفرادیت میں ملتی ہے۔
- اصل حقیقت یا مادہ وہی ہے جو اپنی ذات میں مکمل ہے اور اسے اپنی ذات یا وجود کے ہونے کے لیے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔
- کسی چیز کا آفاقی تصور اس چیز کے مادی وجود کے بغیر ناممکن ہے۔
- انسانیت کا تصور دنیا میں موجود مادی وجود رکھنے والے انسانوں کے باعث ہے۔
- مادے سے مادے کی صفات کو علیحدہ کرنے کا مطلب مادے کو مادے

سے علیحدہ کرنا ہے۔

- طاقت کی نفسیات غرور اور جارحیت جبکہ کمزوری کی نفسیات انکساری اور مصالحت پسندی کے عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔
- مادے کی صفات آفاقی ہیں جو اپنے اپنے طور پر مادے کا ایک آفاقی تصور پیش کرتی ہیں۔
- آدمی میں اگر اس کی مخصوص صفات ختم ہو جائیں تو وہ ایک فرد تنہا رہ جاتا ہے۔
- اصل مواد مادہ ہے۔
- کسی چیز کے بنانے میں چار علتیں کار فرما ہوتی ہیں۔ پہلی چیز وہ مواد یا مادہ ہے جس سے چیز کو بنایا جائے۔ پھر بنانے والے کی مہارت تیسرا وہ تصور یا شکل ہے جس کے مطابق چیز نے تیار ہونا ہے اور چوتھا وہ خاص مقصد ہے جس کے تحت کوئی چیز تشکیل پاتی ہے۔ دوسری تیسری اور چوتھی علتوں کا مرکب جو پہلی علت پر مقدم ہے "فارم" ہے اور یہی خدا ہے اور چونکہ تینوں علتیں مادہ نہیں ہیں بلکہ خیالی ہیں لہٰذا خدا ایک خیال ہے۔
- چیز کے وجود میں آنے کا اصل مقصد اس چیز کی صورت کا اظہار ہے۔
- اشیاء کامل کا اصل جوہر ان صور پر مشتمل ہے جو ہمارے تصورات کا موضوع ہیں اور صور اشیاء کا باطنی جوہر ہے۔
- فطرت ایک خاص مقصد کی طرف متحرک ہے اور اس حرکت کا مقصد صورت کا اظہار ہے۔
- انسان بڑے سے بڑا کام جذبے سے مجبور ہو کر گزرتا ہے۔
- مادہ اور شکل ناقابل تقسیم ہیں۔
- مادہ اور شکل دونوں رفیق ہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے میں دو

رقیق چیزوں کی طرح ملتے اور جذب ہوتے ہیں۔

- شکل مادہ کی اصل حقیقت ہے۔
- شکل ہی اپنے اندر کسی مادی چیز کے اس مقصد کو رکھتی ہے جس کے لیے وہ چیز وجود میں آتی ہے۔
- فارم (Form) میں مادے کی تمام صفات موجود ہوتی ہیں۔ مادے کی تمام صفات آفاقی ہیں اور یہ ہر جگہ اور ہر وقت ایک جیسی ہیں۔
- مادہ جو بنیادی طور پر ایک بے شکل مواد ہے پر اس مادی چیز کی بنیاد ہے جو شکل رکھتی ہے۔
- مادہ بنیادی طور پر بے صفت' بے کردار اور بے نقش ہے۔
- کوئی چیز جو ایک خاص صفت رکھتی ہے وہ اپنی جیسی صفت رکھنے والی چیز سے مل کر ایک جماعت بنتی ہے اور ایک چیز کو دوسری چیز سے صرف صفات کی بنیاد پر الگ یا علیحدہ یا ممیز کیا جا سکتا ہے۔
- مادہ صرف ایک اہلیت یا امکان کی مانند ہے جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کی چیز بن سکتا ہے۔
- ہر شکل میں ایک خاص مقصد پنہاں ہے اس لیے ہر شکل ہر قسم کے مادے کو یکساں طور پر متحرک کر سکتی ہے۔
- اہلیت یا امکان اپنے اندر اہلیت اور امکان کی صفات رکھتا ہے اور کسی وقت بھی شکل میں آ کر حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے۔
- حرکت ایک اندرونی خیالی کشش ہے جو کسی چیز کو ایک خاص مقصد کے لیے حرکت پر مجبور کرتی ہے۔
- مادہ ایک خاص مقصد کے تحت حرکت کرتا ہے اور یہی مقصدیت اس پر اثر انداز ہو کر اسے متحرک یا تبدیل کرتی ہے۔
- مقصد اور شکل کا اصول خیال حقیقت میں حتمی اولیت کا حامل ہے۔

- مقصد ہی فارم کا اصول ہے اور فارم آفاقی ہے۔
- اختتام یعنی اصل مقصد ابتدا پر مقدم ہے۔
- علم منطق فن تحقیق کی تمہید اور حکمی اسلوبیات ہے۔
- جزو کو کل سے اور معلول کو اس کے علل سے اخذ کرنا دراصل حکمت ہے۔
- انسانی زندگی میں علم کا حصول معکوس سمت سے شروع ہوتا ہے۔
- روح اپنی فطرت عاقلہ میں تمام علم کا امکان رکھتی ہے۔
- یقینی علم کے حصول کے لیے انفرادی مشاہدات سے کلی تجربات کی تجرید کرنی پڑتی ہے۔
- ہم حافظے کی مدد سے ادراک سے تجربے اور تجربے سے علم کی طرف بڑھتے ہیں۔
- تمام تر انسانی غلطیاں حواس کی شہادت کی غلط تاویل سے پیدا ہوتی ہیں۔
- سلوجزم ایک بیان ہے جس میں بعض مقدمات کی بنیاد پر ایک مقدمہ بطور نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔
- تصدیق موضوع اور محمول پر مشتمل ہوتی ہے۔
- تخالف، تناقص اور تضاد پر مشتمل ہوتا ہے۔
- صحیح اور غلط کا دار و مدار تصورات کی تحریک اور اجتماع پر ہوتا ہے۔
- ثبوت قیاسیات کی ترکیب سے حاصل ہوتا ہے۔
- بالواسطہ علم کے لیے بلاواسطہ علم مقدم ہے۔
- قانون اجتماع نقیضین فکر کا سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ یقینی اصول ہے۔
- جب دو چیزیں ایک دوسرے سے بعید ترین ہوں تو متضاد کہلاتی ہیں۔

- جب ایک تصور دوسرے تصور کی مطلق نفی ہو تو انہیں تناقض کہا جاتا ہے۔
- ہر قسم کا تصور مقولات عشرہ یعنی جوہر' کمیت' کیفیت' اضافت' این متی' مقام' قبضہ' فعلیت اور انفعال میں سے ایک نہ ایک کے تحت ضرور آتا ہے۔
- حرکت کی چار قسمیں ہیں۔ حرکت جوہری' حرکت کمیتی' حرکت کیفیتی اور حرکت مکانی۔
- عالم کے باہر نہ زماں ہے اور نہ مکاں۔
- جسم محیط کے باہر کی حد ہے اور وقت ماقبل اور مابعد کی جانب حرکت کا شمار ہے۔
- فطرت کوئی کام بغیر مقصد کے نہیں کرتی۔
- عالم دو حصوں عالم فوق القمر اور عالم تحت القمر میں منقسم ہے اور عالم کی شکل محدود ہے۔
- ستارے ذی حیات اور ذی عقل الہی ہستیاں ہیں جو نوع انسانی سے بہت بالاتر ہیں۔
- حیات حرکت ذاتی کی استعداد کا نام ہے۔
- نباتات کی زندگی تغزیہ اور تناسل پر مشتمل ہے۔
- ایک روح تین اجزا روح غذائی' روح حسی اور روح عقلی پر مشتمل ہوتی ہے۔
- روح کا محل نفس گرم (Pneuna) زندگی کا ماخذ ہے۔
- انفعالی نفس جسم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور فنا ہوتا ہے جب کہ فعلی نفس ازلی اور ابدی ہے۔
- انسان کے وہ روحانی افعال جو اس کو حیوانی زندگی سے بلند کرتے ہیں

عقل کے ساتھ روح کی ادنیٰ قوتوں کے اتحاد پر مبنی ہیں۔

- جن صفات پر سعادت کا مدار ہے وہ فکر ارادے کی خوبیاں ہیں۔
- نیکی ارادے کی پاکیزہ صفت ہے اور ہماری فطرت کے مطابق عقل کے مقرر کردہ اعتدال پر مشتمل ہے۔
- اخلاق کا مطلب افراط و تفریط کا درمیانی راستہ اختیار کرنا ہے۔
- عدل جزا و سزا کا صحیح تعین ہے۔
- نفس سب سے بڑا وحشی درندہ ہے۔ نفس کی وجہ سے پیدا ہونے والے جذبات انسانی اذہان کو بے راہرو کر دیتے ہیں۔
- حرکت اور تبدیلی کی بنیادی وجہ ایک عظیم تر مقصد کی کشش ہے اور یہ مقصد فارم (Form) میں ہے۔
- خدا خیال اور عقلی استدلال ہے۔ وہی حتمی مقصد ہے۔ تمام مادی وجود بے اختیار ایک خاص کشش کے تحت اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سب سے اعلیٰ اور عظیم ترین مقصد ہونے کی بنا پر اس کی ذات مکمل ہے۔ وہ ماہر اور کاریگر ہے اور اصل قوت محرکہ ہے۔ تمام حرکت اور تبدیلی اسی کے باعث ہے وہ پہلا اور ایک ایسا محرک ہے جو خود ذرا سی بھی حرکت کیے بغیر سب چیزوں کو متحرک کرتا ہے۔ وہ خود بے حرکت ہے کیونکہ وہ اپنے خاص مقصد کے لیے ہر چیز کو متحرک کرتا ہے۔ وہ خیال کا خیال ہے صرف اپنی ہستی کو سوچتا ہے۔ وہ نہ اپنی ذات کا فاعل ہے اور نہ ہی مفعول۔ وہ مادی اشیاء کا نہیں بلکہ آفاقی تصورات کا خالق ہے۔ وہ ابدی رحمت میں رہتا ہے اور اس کی ابدی رحمت یہ ہے کہ وہ مسلسل اپنی ذات کی تکمیل کے حسن کے بارے میں سوچتا یا فکر کرتا ہے۔
- ایک حتمی تصور باقاعدہ وجود نہیں رکھتا بلکہ خیال ہی کی حد تک حتمی اور حقیقی ہوتا ہے۔

- اس پوری کائنات میں فقط انسان ہی ایک ایسی جنس ہے جو شعوری طور پر اپنے ذاتی مقاصد سے آگاہ ہے۔
- جو جانور یا جاندار بظاہر عقلی عمل کرتے نظر آتے ہیں ان کا ہر عمل جبلی ہوتا ہے۔
- معیار کی مقدار کے علاوہ اپنی ایک الگ حیثیت ہے۔
- چیزوں کی نوع ابدی ہے۔ ان کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔
- ہر انسان خوشی یا سکون کا متلاشی ہے اور اصل خوشی وہی ہے جو اچھے کام سے حاصل ہوتی ہے۔
- کائنات کی ہر چیز کی اچھائی یہ ہے کہ وہ اپنا کردار درست طور پر ادا کرے۔
- انسان کو حقیقی خوشی عقلی استدلال کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔
- انسان عقلی استدلال کے علاوہ حواس خمسہ کے باعث حسیات کا بھی اسیر ہے۔
- انسان کی عقلی اور استدلالی زندگی اطوار میں موجود ہوتی ہے اور نچلے یا چھوٹے درجے کی اچھائی یا جبلت اس کے جذبات اور حسیاتی بھوک سے منسلک ہے۔
- نیکی اور اچھائی کی اعلیٰ و ارفع قسم "Dianoetic" ہے اور اس کیفیت میں انسان پر عقلی استدلال' اخلاق اور خیال چھایا ہوتا ہے اور یہ مقام وہ ہے جہاں وہ خدا کی ذات کا پرتو بن جاتا ہے۔
- بیرونی حالات اور وسائل انسان کو اعلیٰ و ارفع درجے کی اچھائی اور اخلاق کو حاصل کرنے میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔
- سفلی جذبات اور حسیاتی بھوک انسانی نفسیات کا جزو ہے۔
- اصل نیکی اور اچھائی یہ ہے کہ عمومی یا نچلے درجے کے جذبات اور

حیاتی بھوک کو عقلی استدلال اور اخلاق کے تحت لایا جائے۔

- انسان کے اندر موجود سفلہ جذبات اور حیاتی بھوک پر عقلی استدلال سے قابو پایا جاسکتا ہے۔
- انسان میں آہستہ آہستہ اخلاقی عادات پیدا کی جانی چاہییے۔
- اعلیٰ درجہ کبھی ادنیٰ درجہ کو ختم نہیں کرتا ورنہ انسانی نفسیات کا ارتقا رک جاتا۔
- بصیرت نیکی کی علت اور معلول ہے۔
- گہری بصیرت مسلسل کوشش اور ریاض سے پیدا ہوتی ہے۔
- جو شخص گہری بصیرت رکھتا ہے وہی صحیح طور پر جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔
- بہادری دراصل بزدلی اور اندھی دلیری کے درمیان اعتدال کا ذریعہ اور ایک تصور ہے۔
- معتدل سخاوت دراصل کنجوسی اور فضول خرچی کے درمیان ایک معتدل کیفیت یا حالت ہے۔
- Distributive انصاف کا کام اچھے اور باصلاحیت افراد کو ان کی کارکردگی کے مطابق درجات عطا کرنا ہے جبکہ Corrective انصاف کا کام مجرموں کو اصلاح کی غرض سے ان کے جرائم یا غلطیوں کے مطابق سزا دینا ہے۔
- ہر اچھی چیز کے دو جزو ہوتے ہیں پہلا جزو یہ ہے کہ تعریف کے ذریعے متذکرہ شے کو ایک جماعت میں داخل کیا جائے اور دوسرا جزو یہ ہے کہ اس بات کی توضیح کی جائے کہ زیر بحث شے اسی قسم کی دوسری اشیاء سے مختلف کس طرح ہے۔
- انسانی دماغ کی دو صورتیں ہیں اول کسی چیز کو دیکھنا دوم اس پر سوچنا۔

- انسان دراصل حیوان ناطق ہے اور اس کے نطق نے معاشرہ کو جنم دیا۔
- ہر اسم نکرہ جس کا کلیتہ " ایک جماعت کے افراد پر اطلاق ہو سکے کلی ہوتا ہے اور یوں حیوان، انسان، کتاب اور درخت کلی ہیں۔ یہ اسماء ہیں اشیاء نہیں۔
- ہم سے جو کچھ بھی خارج ہے وہ انفرادی اور مخصوص اشیاء کا عالم ہے۔ یہ عالم کلیات کا نہیں ہے اور نہ ہی انسان کلی کا کوئی وجود ہے۔
- ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اشیاء کی طرف لوٹے، فطرت اور حقیقت کا نظارہ کرے۔ حقیقی اور اصلی جزئیات کو دوسری اشیاء پر ترجیح دے اور گوشت پوست کے انسان کو پسند کرے۔
- اگر کسی فرد میں اس جماعت کے جس کا وہ رکن ہے بہت سے خصائص موجود ہوں تو اس بات کا قوی امکان موجود ہو گا کہ اس فرد میں اس جماعت کے مخصوص اوصاف بھی موجود ہوں۔
- قیاس استدلال کا بیان ہے۔ فکر مقدمات سے شروع ہوتا ہے اور نتائج کا طالب ہوتا ہے۔
- فطرت میں خلاء ناممکن ہے کیونکہ خلا میں تمام انسانوں کے گرنے کی رفتار یکساں ہو گی اور یہ خود ناممکن ہے۔
- ہمارے نظام کا محور زمین ہے۔
- دنیا عالم کا دور ہے۔ سورج مستقل طور پر سمندری پانی کو بخارات میں تبدیل کرتا رہتا ہے اور آخر کار یہ سمندر خشک ہو کر محض چٹانوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس بخارات بادلوں میں تبدیل ہو کر پانی برساتے ہیں اور سمندروں اور دریاؤں کو نئی زندگی بخشتے ہیں اور اس طرح تغیر کا عمل دائماً موثر لیکن غیر مرئی طریقے سے جاری رہتا

ہے۔

- پہلے انسان عقلمند ہوا اور پھر اس نے ہاتھوں کا نیا استعمال سیکھا۔ اس طرح زندگی بتدریج قوی تر اور پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی۔
- عقل انسان نے ساخت کی پیچیدگی اور جسم کی حرکت پذیری کے مطابق ترقی کی۔ اس طرح افعال و اعمال میں تخصیص بڑھا، عضویاتی اختیار ایک مرکز پر جمع ہوا اور پھر آہستہ آہستہ زندگی نے اپنے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایک نظام اصلی اور دماغ پیدا کیا اور پھر ذہن انسانی ماحول کی تسخیر کی طرف بڑھا۔
- عمل تولید میں مرد کا نطفہ محرک کا کام کرتا ہے۔
- دماغ خون کو ٹھنڈا کرنے کا ایک آلہ ہے۔
- مرد کی کھوپڑی میں عورت کی کھوپڑی کی نسبت زیادہ جوڑ ہیں۔
- مرد کے دونوں طرف آٹھ آٹھ پسلیاں ہوتی ہیں۔
- عورتوں کے دانت مردوں سے کم ہوتے ہیں۔
- پرندے اور رینگنے والے جانور ساخت کے اعتبار سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔
- بندر چوپائے اور انسان کے بین بین شکل وصورت رکھتا ہے۔
- دراصل انسان کا تعلق دودھ پلانے والے جانوروں کے گروہ سے ہے۔
- بچپن میں انسان اور جانور کی روح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔
- غذا سے طرز حیات متعین ہوتا ہے۔
- کچھ جانور مل جل کر اور کچھ تنہا رہنا پسند کرتے ہیں لیکن ان سب کا مقصدِ حیات صرف اور صرف حصول غذا ہے۔
- جنس کے اوصاف ارتقا پانے والے عضویے میں ان صفات سے پہلے

پیدا ہوتے ہیں جو نوع کے لیے مخصوص ہیں جبکہ کسی نوع کے مخصوص فرد کی صفات سب سے بعد میں ظاہر ہوتی ہیں۔

- کوئی نوع یا فرد جس قدر ارتقا یافتہ یا صاحب تخصیص ہوگا اسی قدر اس کی اولاد کم ہوگی۔
- جاندار اپنے اصل نمونے کی طرف لوٹتا ہے۔
- مچھلیاں گھونسلے بناتی ہیں۔
- جو شخص ابتدا سے ہی جانداروں کی نشوونما پر دھیان رکھتا ہے اس کا اسلوب نظر بہترین ہوتا ہے۔
- بچے کی جنس کا انحصار اس بات پر ہے کہ نطفہ کس بیضے سے نکلا ہے۔
- دنیا میں ہر چیز ایک داخلی تحریک سے متاثر ہو کر اصل سے بڑی بننے کی خواہش رکھتی ہے۔
- ہر چیز بیک وقت اس خام مواد جس سے وہ پیدا ہوتی ہے کی صورت اور اس صورت کا خام مواد بھی ہوتی ہے۔ بچہ صورت اور جنین اس کا خام مواد جبکہ جنین صورت اور بیضہ اس کا خام مواد ہوتا ہے۔
- ہر شے کی صورت ہوتی ہے اور صورت خام مواد کی حقیقت کی تکمیل یافتہ شکل ہے۔ صورت شکل ہی نہیں بلکہ قوت شکل ساز بھی ہے اور ایک تحریک اس سے کام لیتی ہے۔
- زندگی کا ارتقا دراصل فطرت حقیقی میں صورت کے ہاتھوں خام مواد کی تسخیر ہے۔
- دنیا میں ہر چیز اپنے منصب کی تکمیل میں لگی ہوئی ہے اور ہر چیز داخلی تحریک کی راہنمائی میں کام کرتی ہے۔
- مرغی کے چوزہ کا بلغ نہ ہونا مقدرات امور میں داخل ہے۔
- اشیاء کی نوعیت اور ان کی غایت ایک داخلی چیز ہے اور اس شے سے

جو کام بھی لینا مقصود ہے اس سے مربوط ہے مشیت الٰہی کلی طور پر علل فطری کے عمل سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

- ہم یہ طے کرسکتے ہیں کہ ہم نے کیا بننا ہے۔
- ہمیں یہ اختیار حاصل ہے کہ ہم اپنے احباب' کتب' مشاغل اور تفریحات کا انتخاب کر کے اپنی مسرت کو مطلوبہ خطوط پر ڈھال سکیں۔
- ہم جو بہ تسلسل تحسین و مذمت کرتے ہیں اس سے لازم ہے کہ ہم اخلاقی طور پر اپنے افعال کے ذمہ دار اور اپنے اعمال میں مختار ہیں۔
- روح ہر عضویے کی اصل موثر کی کلیت ہے۔
- پودوں میں روح محض قوت تغزیہ و تولید کا نام ہے۔
- جانوروں میں روح صاحب حس ہو جاتی ہے اور یہی روح حرکت کی قوت کا ماخذ اور انسان میں استدلال اور فکر کی طاقت ہوتی ہے۔
- روح جسم کی تمام قوتوں کا مجموعہ ہے اس لیے جسم کے بغیر متصور نہیں ہو سکتی۔
- روح انسانی کی قوت ناطقہ کا ایک جزو انفعالی ہے جو قوتِ حافظہ سے مربوط اور قابل فنا ہے جبکہ عقل فعلی انحطاط سے ماورا ہے۔
- تخلیقات فنی کا ماخذ تحریک تشکیل ہے' جذبے کے اظہار کی آرزو فن حقیقت کی نقل ہے اور ادنیٰ درجے کے جاندار نقالی کی لذت سے ناآشنا ہیں۔
- آرٹ یا فن کا مقصد باطنی معنویت کا اظہار ہے۔ اچھا آرٹ یا فن عقل و احساس کو متاثر کرتا ہے۔
- غنائی داستان تشکیل و ارتقا کی بنا پر ہمیں متاثر کرتی ہے ذہن و عقل کو اس طرح جو لذت ملتی ہے وہ انسان کی بہترین مسرت ہے۔
- انسانی زندگی کا بنیادی مقصد مسرت کا حصول ہے۔

- ہم مسرت کی تحصیل اس لیے کرتے ہیں کہ مسرت کے خواہاں ہیں اور ہمارا مقصد اس سے آگے کچھ اور نہیں ہوتا۔
- مسرت دراصل ایک بہترین پر تعیش اخلاقی زندگی ہے۔
- انسانی مسرت یہ ہے کہ انسانیت کی اس صفت لازمی کے تقاضوں کو پورا کیا جائے جو ہمیں دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔
- زندگی کا مقصد حصول مسرت ہے اور یہ عاقلانہ زندگی بسر کرنے سے مشروط ہے بلکہ یہ انسان کامل کے تجربات کا ماحصل ایک راہنما اور راہ اعتدال ہے۔
- فضائل اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔
- فضیلت ایک فن ہے جو عادت اور ترتیب سے حاصل ہوتا ہے۔
- اعمال فضائل کی تکرار سے سیرت متعین ہوتی ہے۔
- جوانی انتہا پسند ہوتی ہے اور قصور وار نوجوان کا رخ افراط و انتہا کی طرف ہوتا ہے۔
- جہاں خلوص نہیں ہوتا وہاں اس کا اظہار شدومد سے کیا جاتا ہے۔
- عجز دائرہ غرور کے نزدیک تر ہوتا ہے اور کسی وقت بھی غرور میں تبدیل ہوسکتا ہے۔
- راہ اعتدال حاصل کرنے کے لیے مقابلے کی افراط و تفریط کا مرتکب ہونا چاہیے۔
- بقدر ضرورت دولت ضرور حاصل کرنی چاہیے۔
- دولت تفکرات و حرص سے نجات دلاتی ہے۔
- افلاس انسان کو بخیل اور حریص بناتی ہے۔
- دوستی کا مطلب یک جان دو قالب ہونا چاہیے۔
- دوست کم ہونے چاہیں جس کے بہت دوست ہیں اس کا کوئی دوست

نہیں۔

- صحیح دوستی کا انحصار امتداد زماں پر ہے۔
- دوستوں کی سیرت میں استقلال ضروری ہے۔
- محسن ان لوگوں کے دوست ہوتے ہیں جن پر احسان کرتے ہیں لیکن جن لوگوں پر احسان کیا جاتا ہے وہ اپنے محسنوں کو دوست نہیں رکھتے۔ محسن کو جو محبت ان لوگوں سے ہوتی ہے جن پر وہ احسان کرتے ہیں اس کی مثال وہ محبت ہے جو فنکار کو مخلوقات ہنر سے ہوتی ہے یا ماں کو بچے سے۔
- معیاری اور فوق الانسان خود کو خواہ مخواہ خطروں میں نہیں ڈالتا لیکن نازک آزمائشوں میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں کے کام آتا ہے لیکن خود دوسروں کا احسان لینے سے گریز کرتا ہے۔ کھیل تماشوں میں حصہ نہیں لیتا۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا کھلا اظہار کرتا ہے۔ اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں جذبات تحسین کا جوش نہیں ہوتا۔ وہ کسی بھی قسم کی غلامی کی زندگی کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ بغض سے مبرا ہوتا ہے۔ انتقامی کارروائی نہیں کرتا۔ وہ دکھ بھول جانے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ نہ تو باتونی ہوتا ہے اور نہ ہی خوشامدی۔ وہ دوسروں کو برا بھلا نہیں کہتا۔ دشمنوں کی مخالفت منہ پر کرتا ہے۔ اس کی چال باوقار' اس کی آواز گرجدار اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات اٹل اور الفاظ بڑے جچے تلے ہوتے ہیں۔ وہ جلدی نہیں کرتا اور نہ ہی جلد متاثر ہوتا ہے۔ وہ جوشیلا نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے واقعات بڑی بردباری سے برداشت کرتا ہے۔ حالات کو اپنے رنگ میں ڈھال کر فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ بہترین دوست ہوتا ہے اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔
- معمولی سی بات کے لیے قوانین میں تغیر و تبدل کرنا باعث فساد ہوتا

ہے۔

- قوانین میں تغیر سے اگر کوئی فائدہ حاصل ہو تو قانون اور فرمانروا کے نقائص کے بارہ میں فلسفیانہ تحمل سے کام لینا چاہیے۔
- شہری کی نافرمانی کی عادت سے جو نقصان ہوتا ہے وہ تغیر سے ہونے والے فائدہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔
- پرانے قوانین کی جگہ نئے قوانین کا نفاذ قانون کی بنیاد کمزور کرنے کے مترادف ہے۔
- اگر تمام لوگ تمہارے بھائی ہیں تو سمجھ لیں کہ تمہارا کوئی بھائی نہیں۔ معاصر کو بھائی یا بہن کہنا درست نہیں ہے۔
- جو چیز بہت سے لوگوں کے درمیان مشترک ہوتی ہے اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اشتراک ملکیت کی راہ میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔
- ولادت کے وقت سے ہی کچھ لوگ حکومت کے لیے اور کچھ محکومیت کے لیے موضوع ہوتے ہیں۔
- تمام کم رتبہ ذہن رکھنے والے انسانوں کو کسی آقا کی حکومت کو تسلیم کرنا چاہیے۔
- غلام ذی روح آلہ کار ہے اور آلہ کار بے روح غلام ہے۔
- اگر کسی ہاتھ کی دخل اندازی کے بغیر کپڑے کا تانا بانا تیار ہوتا ہے اور مضراب بربط پر خود بخود پھرنے لگے تو مزدوروں کے سرگرد ہوں کو ملازموں کی ضرورت نہیں پڑے گی اور آقا غلام کے محتاج نہیں ہوں گے۔
- محنت مزدوری ذہن کو کند اور روبہ زوال کر دیتی ہے۔
- مزدور کے پاس نہ تو سیاسی ذہانت کا وقت بچتا ہے اور نہ طاقت باقی رہتی ہے۔ لہذا حکومت میں ان لوگوں کو دخل دینا چاہیے جن کے پاس

وقت ہو۔

- پرچون کی تجارت غیر فطری ہے۔
- باہمی استفادے کی سب سے شرمناک صورت سود خوری ہے جو محض روپے کے وجود سے فائدہ اٹھاتی ہے۔
- سود کا ماخذ سود خوری نفع اندوزی کی بدترین صورت ہے۔ روپے کو جننے کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔
- شادی بیاہ میں کم سے کم اور زیادہ عمر کے تعین اور آبادی پر کنٹرول مملکت کی ذمہ داری میں شامل ہے۔
- مرد عورت پر فوقیت رکھتا ہے اور یہ اصول تمام عالم انسانیت میں جاری و ساری ہے۔
- مرد آقا' ذہین' مہذب اور حاکم ہے جبکہ عورت نامکمل مرد' کنیز' وحشی' مفتوح اور ارتقا کی زبان میں ایک قدم پیچھے کھڑی ہے۔
- عورت کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے۔
- عورت کا فرض ہے کہ وہ گھر کے کام کاج کرے اور خارجی معاملات میں مرد کی مطیع رہے۔
- عورتوں کو مرد کے متشابہہ نہیں ہونا چاہیے۔
- مرد اور عورت کی شجاعت میں واضح فرق موجود ہے۔
- مرد اور عورت میں اختلافات رہنے چاہیں کیونکہ اختلافات ہی باعث کشش ہوتے ہیں۔
- جو کام مرد کی دست درازی سے نہیں ہوتا وہ عورت کی زبان درازی سے ہو جاتا ہے۔
- 37 سال کے مرد کو 20 سال کی عورت سے شادی کرنی چاہیے۔
- مرد 70 سال تک اور عورت 50 سال تک بچے پیدا کر سکتی ہے۔

- چھوٹی عمر میں شادی کرنے سے بچے کمزور پیدا ہوتے ہیں۔
- صحت محبت سے زیادہ اہم ہے۔
- جلدی شادی نہ کرنے والا شخص دائرہ اعتدال میں رہتا ہے۔
- جو عورتیں جلدی شادی کر لیتی ہیں ان میں جنسی گمراہی پیدا ہو جاتی ہے۔
- جو مرد جلدی شادی کر لیتے ہیں ان کی نشوونما رک جاتی ہے۔
- آبادی میں اضافے کی صورت میں اسقاط سے کام لینا چاہیے اور یہ اسقاط آغاز زندگی سے پہلے ہو جانا چاہیے۔
- جس مملکت کی آبادی کم ہوگی وہ خود کفیل نہیں ہوگی۔
- جس مملکت کی آبادی زیادہ ہوگی وہ مملکت نہیں بلکہ قوم بن جاتی ہے اور اس مملکت میں آئینی حکومت ممکن نہیں رہتی۔
- دس ہزار سے زیادہ آبادی ناپسندیدہ ہے۔
- تعلیمی نظام حکومت کی ذمہ داری ہے۔
- مدرسوں پر حکومت کے کنٹرول سے شہریوں کو زراعت' صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے۔
- عام لوگوں کو تمام اشیاء کے استعمال کی اجازت ہونی چاہیے اور لوگوں کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ ملکیتی اشیاء ان کی مرضی سے اگر دوسرے لوگ استعمال کرلیں تو اس میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔
- ہر شہری کو مطابقت قانون کی تعلیم دینا ضروری ہے۔
- جس نے قانون کی اطاعت نہیں سیکھی وہ حکومت کرنا بھی نہیں سیکھ سکتا۔
- قانون کے نفاذ سے آزادی پیدا ہوتی ہے۔
- انسان مکمل ہو تو اشرف المخلوقات اور تنہا ہو تو بدترین حیوان ہوتا

ہے۔

- مسلح ناانصافی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔
- انسان پیدا ہوتے ہی عقل اور سیرت سے متصف ہوتا ہے اور وہ انہیں بدترین مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔
- اگر انسان فضیلت سے معریٰ ہو تو ناپاک اور وحشی جانور سے بدتر ہے۔
- معاشرتی نگرانی ہی انسان کو فضیلت سے آراستہ کرتی ہے۔
- معاشرے سے عقل، عقل سے تنظیم، تنظیم سے تہذیب پیدا ہوتی ہے۔
- منظم مملکت میں فرد کی ترقی کے ایسے امکانات روشن ہوتے ہیں جن کا تنہائی کی زندگی میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔
- معاشرتی تنظیم اطمینان پیدا کرتی ہے لیکن اس کی قدر نہیں کی جاتی۔
- انقلاب غیر دانشمندانہ فعل ہے۔ اس سے تنظیم درہم برہم ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔
- نوجوان آدمی جلد امیدیں وابستہ کرنے کی وجہ سے جلد دھوکہ کھا جاتا ہے۔
- انقلاب کے نتیجہ میں قائم ہونے والی حکومتیں رعایا کی عادات مستمرہ کو بدلنے کی کوشش میں مٹ جاتی ہیں۔
- آئین کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے تمام اجزا اس کے قیام کے لیے خواہاں ہوں۔
- انقلاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ فرمانروا نہ تو لوگوں کو مفلس ہونے دے اور نہ امیر۔ تو آبادیات قائم کریں اور مذہبی راہنماؤں کی تربیت کرے اور خود بھی مذہبی شعار کا پابند رہے۔

- حکومت کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ تمام اقتدار بہترین فرد میں مرکوز ہو جائے۔
- شہنشاہیت حکومت کی بدترین اور اشرافیہ بہترین صورت ہے۔
- طبیب کا ممتحن طبیب ہی ہونا چاہیے۔
- صحیح انتخاب وہی لوگ کرسکتے ہیں جو خود باخبر ہوں۔
- مملکت کے جلیل القدر عہدے اور منصب کی خریداری بلاشبہ بہت بری بات ہے۔ جو قانون اس فساد کو جائز قرار دیتا ہے وہ گویا دولت کو لیاقت پر ترجیح دیتا ہے۔
- کسی مملکت میں منصب دار جس چیز کو قابل تعظیم قرار تصور کریں گے تو شہری بھی ان کی تقلید کریں گے۔
- عمومیہ بالعموم سرمایہ داری کے خلاف بغاوت ہوتی ہے۔
- ارباب حکومت کی مفاد پرستی ان کی تعداد کو مستقل طور پر کم اور عوام کو طاقت بخشتی ہے جس سے عمومیہ قائم ہوتی ہے۔
- عمومیہ اشرافیہ کے مقابلے میں فرمانروائی کی ادنیٰ صورت ہے۔
- قانون کی نظر میں عام لوگ آزاد، یکساں اور ہر معاملے میں مساوی ہیں۔
- عوام بہت جلد گمراہ ہوتی ہے۔ ان کے خیالات و عقائد بدلتے رہتے ہیں۔
- خفیہ رائے دہی ارباب عقل کو ملنی چاہیے۔
- اشرافیہ اور جمہوریہ پر مبنی دستوری حکومت سے بہتر حکومت کا قیام عملاً ممکن نہیں ہے۔
- محض آرزو پر مبنی معیاری مملکت کا تصور بیکار ہے۔
- زندگی ایسی متصور ہونی چاہیے کہ لوگوں کی اکثریت اس میں شریک

ہو سکے اور طرز حکومت ایسا ہونا چاہیے کہ بالعموم مملکتیں اس کے قیام میں کامیاب ہو سکیں۔

- مملکت کا وہ جزو جو حکومت کی بقا کا متمنی ہو مخالف جزو سے قوی ہونا چاہیے۔
- قوت محض تعداد' ثروت' فوجی و سیاسی استعداد و لیاقت سے نہیں بلکہ ان کے مجموعے سے پیدا ہوتی ہے۔
- ملت کا کام مقاصد و غائیت کا تعین کرنا ہے۔
- وسائل و ذرائع کا انتخاب اور ان سے کام لینا ماہرین کا کام ہے۔
- منصب اور عہدوں پر موزوں اور تجربہ کار لوگ متعین ہونے چاہیں۔
- فطرت انسانی زندگی پر محیط ہے اور فطری اصول حیات انسانی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔
- افراد فطری اصول و قوانین پر عمل کر کے مستحکم معاشرہ قائم کر سکتے ہیں اور اسی سے ہی مملکت کے مقاصد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔
- افراد کا اخلاقی اصولوں پر کاربند رہنا فطرت کے عین مطابق ہے۔
- فطری اور اخلاقی اصولوں پر عمل کر کے افراد اور معاشرہ اور فطرت کے مابین مثالی ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔ جس سے انسان اور فطرت دونوں کی تکمیل ممکن ہے۔
- علم سیاسیات کا ماہر جو صرف مثالی مملکت یا اخلاقی اقدار پر مبنی مملکت کا خاکہ پیش کرے برائے نام مفکر ہوتا ہے۔
- ایک ماہر سیاسیات کو حقیقی مملکتوں کے یا ایسے سیاسی' معاشرتی اور تعلیمی نظاموں کا جو جاری و ساری ہوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔
- کائنات ایک اصل اور ٹھوس ابدی حقیقت ہے جس کا ہم اپنے حواس

کے ذریعے مشاہدہ کرسکتے ہیں اور اس کے موجودات کو اپنی تمدنی زندگی کی تکمیل کے لیے بروئے کار لاسکتے ہیں۔

- کائنات کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ ابدی اور مستقل ہے اس کی تغیر پذیری اور تبدیلی ایک حقیقت ہے لیکن یہ فطرت کے مستقل قوانین کے تابع عمل میں آتی ہے جس سے کائنات کو ایک مسلسل ساخت ملتی ہے۔
- مادہ ہی بنیادی طور پر اپنی اصل میں حقیقت اولیٰ ہے۔ اس لیے مادی دنیا ہی اپنی جگہ حقیقی اور ابدی ہے یہ اپنی اصل میں کوئی نقل نہیں بلکہ اپنی وجودی ہیت میں اصل ہے اس لیے مظاہرات کائنات محض افراد کے ذہن میں موجود تصورات کا عکس ہی نہیں بلکہ انسانی ذہن کے تصوراتی مشاہدے سے ہٹ کر بھی یہ اپنا وجود رکھتے ہیں۔
- انسان ایک حیاتیاتی وجود ہے جو نہایت اعلیٰ قسم کے اعصابی نظام اور ایک معاشرتی مزاج کا حامل ہے۔
- یہ فرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ انسان کا ثقافتی کارنامہ اس کے کسی علیحدہ وجود کی وجہ سے ہے۔ ذہن یا روح دراصل عضویہ کے ایک اعلیٰ پیچیدہ فعل کا نام ہے۔
- مادی کائنات انسانی ذہن میں موجود تصورات سے علیحدہ ٹھوس مادی وجود رکھتی ہے اور یہ ایسے قوانین کے تحت منظم ہے جس پر انسان کو قطعاً کوئی کنٹرول حاصل نہیں بلکہ انسان بذات خود بھی ان قوانین کا تابع ہے۔
- انسان بحیثیت مادی وجود اور اعلیٰ و پیچیدہ عضویے کے منظم کائنات کا ایک حصہ ہے جس کی تخلیق ہر مظاہر فطرت کی طرح بامقصد ہوتی ہے۔
- کائنات کا موجودہ وجود کا مواد حقیقی صرف اور صرف ایک ہے۔

- مبداء کائنات مادہ ہے اور مادے کے علاوہ کوئی اور حقیقت مطلقہ موجود نہیں۔ حیات بھی اسی مادے کی طبعی اور کیمیائی ترکیب کی لطیف ترین صورت ہے۔ نفس یا ذہن بھی اسی مادے کی ایک عضویاتی ترکیب کا موقتی مظہر ہے۔
- دنیا اپنی اصل میں اپنی مادی شکل میں انسانی حواس کو جیسے نظر آتی ہے ویسے ہی ہے۔
- انسانی حواس بہترین ذریعہ علم ہے۔
- علم کا مقصد موجودات کائنات کی اصلیت اور حقیقت کو انسان کے لیے آسان تر بنانا ہے۔
- اقدار بنیادی طور پر معروضی ہوتی ہیں اور معروضیت دراصل حقیقت کی ایک صفت ہوتی ہے۔
- کائنات میں ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون موجود ہے جس کو دلیل کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے اور جس کا اطلاق تمام افراد پر بطور عاقل انسانوں کے ہوتا ہے۔
- اقدار، مستقل، ابدی، غیر متغیر اور غیر زوال ہوتا ہے۔
- انسان سیاسی حیوان ہے۔
- انسان کی انفرادی شخصیت اور اجتماعی زندگی کی تکمیل ایسے مقتدر سیاسی اداروں کے بغیر ممکن نہیں جو اپنی ہمہ گیریت اور دائرہ کار و وظائف کے حوالے سے فرد کی شخصیت پر مکمل انداز میں حاوی ہوں۔
- انسانی حواس انسانی زندگی کے مختلف سیاسی و سماجی ادارت، اقدار، عقائد اور خود انسان کی حقیقت کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔
- محض خیالات کی بنیاد پر کائنات کے مادی وجود اور خود انسان کے حیاتیاتی وجود کے بارے میں کوئی حتمی رائے اس وقت تک قائم نہیں کی

جاسکتی جب تک کہ ہم ان عناصر کی حقیقت کو اپنے حواس اور معروضی مشاہدے کی بنیاد پر تعین نہیں کرتے۔

- بلاشبہ عقل کسی حد تک کائنات اور مظاہرات کی حقیقت تک انسان کی راہنمائی کرتی ہے لیکن مکمل طور پر حقیقت تک رسائی کے لیے عقل پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔
- اگر انسان عقل کے ساتھ اپنے حواس اور مشاہدے کو بروئے کار لائے تو حقیقت اس پر آشکار ہو سکتی ہے۔
- مملکت بحیثیت کُل، مختلف اجزا یا عناصر کا مجموعہ ہے اور یہ اجزا خاندان، گاؤں اور قصبے ہیں۔
- انسانی ضروریات دو قسم کی ہوتی ہیں، اخلاقی ضرورت اور مادی ضروریات۔ اور ان ضروریات کی تکمیل وہ اکیلے نہیں بلکہ دوسروں کے تعاون سے کرسکتا ہے۔ تعاون کی ابتدائی شکل خاندان ہے جو دراصل ایک فطری ادارہ اور مملکت کی تشکیل کی ابتدائی اکائی ہے بہتر شکل گاؤں ہے، جس کی بنیاد چند خاندان مل کر رکھتے ہیں اور اعلیٰ ترین شکل مملکت ہے جو بہت سارے گاؤں کا اجتماع ہے اور جو تمام انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے ایک منظم و مستحکم ادارہ ہے۔
- مملکت ایک فطری ادارہ ہے جو فطری تسلسل کے باعث مرحلہ وار تشکیل پایا۔ مملکت کے ارتقا یا آغاز میں انسانی ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔
- تنہا انسان یا تو خدا ہو سکتا ہے یا شیطان جبکہ انسان بحیثیت سیاسی حیوان نہ تو خدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی شیطان۔ اس لیے انسان کو لازمی طور پر معاشرتی زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔
- بعض مملکتیں تشکیلی بنیادوں پر اخلاقی مقاصد کی حامل اور بعض اخلاقی

اصولوں میں مطابقت نہیں رکھتیں۔

- معیاری مملکت کے مقاصد اخلاقی ہوتے ہیں جبکہ غیر معیاری مملکت میں اخلاقی مقاصد اور قواعد و ضوابط کے علاوہ دیگر مقاصد کو بھی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔
- معیاری مملکتوں کا حکمران طبقہ بے لوث خدمت کا جذبہ رکھتا ہے اور اس کے پیش نظر عوام کی خدمت اور فلاح و بہبود ہوتی ہے جبکہ غیر معیاری مملکتوں کا حکمران طبقہ ذاتی اغراض و مقاصد میں مصروف کار رہتا ہے۔
- ایک شخص کی اچھی حکومت بادشاہت اور ایک شخص کی بُری حکومت استبدادیت کہلاتی ہے۔ چند اشخاص کی اچھی حکومت اشرافیہ اور چند اشخاص کی بُری حکومت چند سری کہلاتی ہے جبکہ بہت سے افراد کی اچھی حکومت آئینی حکومت اور بہت سے افراد کی بُری حکومت جمہوریت کہلاتی ہے۔
- چند سری حکومت بنیادی طور پر خراب نہیں بلکہ دولت مندوں کی حکومت ہوتی ہے اور دولت مند نیت اور ارادے سے خودغرض ہوتے ہیں۔
- جمہوریت غریبوں کی حکومت ہوتی ہے اور بہت زیادہ تعداد کی وجہ سے مملکتی مقاصد کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔
- اشرافیہ طرز حکومت میں اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر القابات' اعزازات اور عہدوں کی تقسیم کی جاتی ہے۔ چند سری حکومت میں عہدوں اور مراعات کی تقسیم کی بنیاد دولت اور جمہوریت میں عہدے اور مراعات صرف پیدائش کی بنیاد پر دیئے جاتے ہیں اور اس میں نیکی یا اطاعت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

- مملکتیں طرز ہائے حکومتوں کی نسبت سے اپنی ہیت میں یا جمہوری ہوتی ہیں یا چند سری۔
- مملکت ایک مرکب اور کل ہے اور اس کا لازمی جزو اس کے شہری ہیں۔
- ہر وہ شخص جو مملکت کے قانونی اور انتظامی معاملات میں شریک ہونے کا حق رکھے اس مملکت کا شہری ہے۔
- قانونی اور انتظامی معاملات یا عدلیہ اور دیگر انتظامی شعبوں سے تعلق فرائض کی بجا آوری ہی وہ Exclusive معیار ہے جس کی بنیاد پر ہر فرد کو شہری کہا جاسکتا ہے۔
- مراعات یافتہ اور فراغت یافتہ طبقہ ہی شہریت کے لائق ہے۔
- غلامی فطرت اور انصاف پر مبنی ہے اور غلامی کا ادارہ مملکت کا ایک جزو ہے۔ غلام مالک کے لیے ایک آلہ کار اور گھریلو زندگی کا لازمی جزو ہے۔ آقا کی حیثیت روح اور غلام کی حیثیت جسم کی سی ہوتی ہے۔
- غلاموں کی حیثیت محض نجی ملکیت جیسی ہوتی ہے اس لیے آقا جب چاہیں انہیں فروخت کرسکتے ہیں اور جس کے نام چاہیں حقوق ملکیت منتقل کرسکتے ہیں۔
- کائنات میں انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوقات میں بھی برتری اور کم تری کا نظریہ کار فرما ہے۔
- آقا کے پاس وقت اور غلام کے پاس عقل نہیں ہوتی۔
- غلامی کا ادارہ آقا اور غلام دونوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ غلام آقا کا بہت سارا کام کرتا ہے جس کی وجہ سے آقا کو فراغت میسر آتی ہے۔ اور وہ مملکتی مقاصد کے حصول ممکن بناتا ہے جبکہ غلام کے پاس عقل نہیں ہوتی اور وہ اپنے آقا کی عقل رائے اور ارادے کے باعث اپنی زندگی کو

مربوط، منظم اور بارابط بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

- غلامی غلام کی فطری منزل ہے۔ غلام کا نصب العین یہی ہے کہ وہ غلام رہے اسی میں اس کی بقا اور اسی میں اس کا فائدہ ہے۔
- غلام کو اپنے تمام تر اعمال و افعال آقا کے کہنے کے مطابق سرانجام دینے چاہییے بالکل اسی طرح جیسے جسم روح کی منشا کے مطابق عمل کرتا ہے۔
- مکمل انقلاب، نامکمل انقلاب، خونی انقلاب، شخصی انقلاب، غیر شخصی انقلاب، طبقاتی انقلاب اور بے مقصد انقلاب دراصل انقلاب کی عمومی شکلیں ہیں۔
- کسی بھی معاشرے کے عمومی، سماجی اور سیاسی نظام کے بنیادی ڈھانچے کے علاوہ اس کے اساسی اصولوں میں تبدیلی مکمل انقلاب کہلاتی ہے۔
- نامکمل انقلاب کی صورت میں یا تو صرف سیاسی نظام کے بنیادی اصولوں کو تبدیل کیا جاتا ہے یا پھر معاشی و معاشرتی نظام کے بنیادی ڈھانچے یا صرف حکومت کو تبدیل کیا جاتا ہے۔
- خونی نوعیت کے انقلاب مکمل یا نامکمل دونوں صورت میں وقوع پذیر ہوتے ہیں اور دونوں صورتوں میں تبدیلی کے عمل کے لیے خون ریزی ہوتی ہے۔
- الیکشن کے ذریعے اکثریت کی بنا پر یا پھر اسمبلی کے اندر آئینی طریقہ کار کے مطابق تبدیلی آئینی انقلاب کہلاتی ہے۔
- مقتدر اعلیٰ کی تبدیلی کو شخصی انقلاب جبکہ مقتدر اعلیٰ کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ سیاسی نظام کے اصولوں اور ضابطوں کے علاوہ معاشرتی ڈھانچے کے ساختی عناصر اور ان کے جملہ قاعدوں کے خاتمہ کو غیر شخصی انقلاب کہا جاتا ہے۔

- محض برسر اقتدار طبقات کی تبدیلی طبقاتی انقلاب کہلاتی ہے۔
- جن مملکتوں میں معاشرتی فلاح اور اخلاقی اصول و ضوابط کا خیال نہیں کیا جاتا وہاں کے عوام حکمرانوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔
- معاشی ناہمواری' عدم مساوات کا احساس' سیاسی جانب داری' متوسط طبقے کا نہ ہونا اور انتہا پسندانہ نظریات بالآخر انقلاب کا باعث بنتے ہیں۔
- معاشی مساوات' سیاسی بدعنوانیوں کا خاتمہ' نظام تعلیم اور نظام معاشرت میں مطابقت اور متوسط طبقے کی موجودگی انقلابات کو مسدود کر دیتی ہیں۔
- مساوات کا صحیح تصور Merite Equality ہے۔
- ذاتی ملکیت کا ایسا نظام ہونا چاہیے جس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ حاصل کر سکیں۔
- افسران بالا اور حکمرانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ انصاف سے کام کریں۔ اقربا پروری اور مالی معاملات میں سیاسی بدعنوانیوں سے گریز کریں۔
- تعلیمی نظام کسی بھی مملکت میں معاشرتی زندگی کی مختلف سمتوں کا تعین کرتا ہے۔ معاشرتی مقاصد اور اقدار و عقائد کے مطابق افراد کی تربیت کرتا ہے۔
- اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقے اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہا پسند ہوتے ہیں اس لیے متوسط طبقہ کا ہونا ضروری ہے۔
- تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعے افراد اور مملکت کے حقوق و فرائض اور اختیارات کے دائرہ کار کا تعین کیا جاسکتا ہے۔
- معاشرے کے افراد کے لیے ایسی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیے جس

سے وہ نہ صرف اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں بلکہ مملکتی مقاصد کی تکمیل بھی کر سکیں۔

- تعلیم کے ذریعے انسان کی جسمانی اور ذہنی نشوونما ہو سکتی ہے۔
- تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو عقل انفعالی اور عقلِ فعالی کی بہترین تربیت کا باعث ہو۔
- جسم کی نشوونما اور بہترین تربیت کے لیے بہترین تعلیم ورزش اور مختلف کھیل ہیں۔
- اخلاقی نشوونما کے لیے موسیقی کی تعلیم لازمی ہے۔
- موسیقی انسانی دل اور دماغ پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس سے نہ صرف روحانی اور ذہنی تربیت ہوتی ہے بلکہ اس سے اخلاق بہتر ہوتا ہے اور جمالیاتی شعور پیدا ہوتا ہے۔
- عقل فعالی کے لیے سائنسی اور خالص فلسفے کی تعلیم ضروری ہے۔
- عقل کی نشوونما کے لیے بچوں کی نفسیات کے مطابق خالصتاً فلسفیانہ مضامین مثلاً مابعد الطبعیات، علم ہندسہ، طبعی تاریخ، طبعیات، ریاضی، حیاتیات، علم نجوم، منطق اور جمالیات پڑھانا چاہیے۔
- تعلیم کا سب سے اہم اور کلیدی مقصد افراد کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔
- تعلیم کے ذریعے ہی انسانی ذہن کی خوابیدہ صلاحیتوں اور ان گنت اسرار و رموز سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔
- تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے معاشرے میں اخلاقی اقدار کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔
- تعلیم ہی وہ بنیادی عنصر ہے جس کے ذریعے اچھائی اور برائی کی تمیز ہو سکتی ہے اور ایک اخلاقی اور نیک زندگی کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔

- تعلیم ہی وہ بنیاد ہے جس کو بروئے کار لا کر افراد کی بہترین خطوط پر تربیت کی جاسکتی ہے۔ تعلیم سے ہی افراد عمل کرنا سیکھتے ہیں اور عمل ہی کا دوسرا نام ایک پر مسرت اور نیک زندگی کا حصول ہے۔
- تعلیم کے ذریعے افراد میں بہترین اوصاف پیدا کیے جاسکتے ہیں۔
- تعلیم کے ذریعے مملکتی مقاصد کی تکمیل کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔
- تعلیم کے ذریعے ہی انسان حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور جانچ پرکھ کے بعد اپنے لیے لائحہ عمل مرتب کر سکتا ہے۔
- ہر مملکت کی ضروریات مقاصد اور اس میں رہنے والے لوگوں کے طبعی رجحانات مختلف ہوتے ہیں اس لیے ہر مملکت کے لیے لازمی ہے کہ مقاصد افراد کے ذہنی رجحانات' طرز زندگی' ضروریات معاشرہ اور دیگر عناصر کو مد نظر رکھتے ہوئے نصاب تعلیم مرتب کرے۔
- بچے کی پیدائش سے بعد کے ادوار تک ہر دور میں بچے کی ذہنی حالت مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا پیدائش سے پانچ سال تک قبل از ابتدائی تعلیم' 5 سے 7 سال تک ابتدائی تعلیم' 7 سے 14 سال تک پرائمری تعلیم' 14 سے 21 سال تک ثانوی تعلیم اور 21 سے بعد تک اعلیٰ تعلیم دی جانی چاہیے۔ قبل از ابتدائی تعلیم بچے کی تربیت والدین خود کریں اور اس تعلیم کے ذریعے بچے کو ورزش اور معمولی کھیل کھلانا چاہیے تاکہ اس کا جسم مضبوط اور توانا ہو۔ ابتدائی تعلیم بھی گھر میں معلمین کی نگرانی میں ہونی چاہیے۔ معلمین کو اس بات کا معائنہ کرنا چاہیے کہ آیا بچے کی نشوونما اور بالیدگی فطری اصولوں کے مطابق ہو رہی ہے۔ اس دور میں والدین کو چاہیے کہ وہ ہر وہ طریقہ آزمائیں جن سے بچے کی خوابیدہ صلاحیتیں اجاگر ہوں۔ پرائمری سطح کی تعلیم کے لیے بچے کو سکول بھیجنا چاہیے۔ اس دور میں بچے کا ذہن کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے لہٰذا

اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچے کی نفسیات اور طبعی میلان کو سامنے رکھ کر اس کورے کاغذ پر بہترین تربیت رقم کریں۔ اس دور میں بچے کو موسیقی اور ریاضی کی تعلیم دینی چاہیے۔ ثانوی تعلیم مملکت کی زیر نگرانی ہونی چاہیے اور اس سطح کے لیے علم ریاضی، علم ہندسہ، علوم نجوم، قانون، اخلاقیات، ادب، فن تقریر، فلسفہ اور سیاسیات کی تعلیم ضروری ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا دور صرف اور صرف ذہنی تعلیم و تربیت کے لیے مخصوص ہونا چاہیے اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں علم طبیعات، حیاتیات، نفسیات، فلسفہ، الٰہیات، منطق اور مابعد الطبیعیات کے مضامین لازمی ہونے چاہیے کیونکہ ان علوم کے ذریعے ہی حقیقت تک رسائی اور فطری قوانین کو سمجھا جاسکتا ہے۔

- تعلیم نجی ہاتھوں کی بجائے مملکتی کنٹرول میں ہونی چاہیے۔
- ابتدائی طور پر والدین ہی بچوں کی بہترین جسمانی اور ذہنی تربیت کرسکتے ہیں۔
- تعلیم وہی بامقصد ہوتی ہے جو بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر دی جائے۔
- تعلیم کی بنیاد تحقیق اور مشاہدات پر ہونی چاہیے۔
- غلام طبقے کے لیے تعلیم اس لیے ضروری نہیں کہ ان کا پیشہ تعلیم و تربیت کے لیے موزوں نہیں۔
- مرد کے مقابلے میں عورت ہر لحاظ سے کمتر ہوتی ہے اس لیے اس کو اعلیٰ تعلیم نہیں دی جانی چاہیے۔
- شاعری انسانی نفسیات، تزکیہ باطن اور تہذیب نفس کے لیے ضروری ہے اور اس فن کا تعلق انسانی فطرت سے ہے۔
- شاعر کا ذریعہ زبان ہے جس میں بحر کی وجہ سے موسیقیت پیدا ہوتی

ہے۔

- شاعر انسان کو حالت عمل میں پیش کرتا ہے۔
- نقل کرنے کی جبلت انسان میں ازل سے ہے وہ ساری مخلوق میں سب سے بڑا نقال ہے اور نقل سے وجود میں آنے والے کاموں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔
- سنجیدہ شاعر شائستہ اعمال اور اعلیٰ لوگوں کے کاموں کو پیش کرتے ہیں جبکہ کم ذہن شاعر ادنیٰ لوگوں کی عکاسی کرتے ہیں۔
- شاعری تاریخ کے مقابلے میں زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ لائق توجہ ہے۔
- تنسیخ ایک حالت سے بالکل ایسی متضاد حالت میں تبدیل ہو جانے کا نام ہے جو قیاس اور ضرورت کے مطابق ہو اور انکشاف ناواقفیت سے واقفیت میں تبدیل ہو جانے کا نام ہے۔
- شاعر یا تو زبردست فطری صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے یا پھر صحیح الدماغ نہیں ہوتا۔ اول الذکر بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اور آخر الذکر عالم جذب میں ہوتا ہے۔

# ارسطو کی موت

سکندر اعظم کے تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد ارسطو کے تمام ارشادات کو عملی جامہ پہنایا گیا اور اس کی عطا کردہ قابلیت کے ذریعے سکندر اعظم نے حکومت اور سیاسی نظام کی جدید بنیادوں پر تشکیل نو کی۔ جوانی میں ہی سکندر اعظم کی فتوحات کی دھاک بیٹھ چکی تھی لیکن کسی بھی محاذ پر شکست نہ کھانے والا سکندر آخر دجلہ کے کنارے موت کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔

سکندر اعظم نے 323 ق م میں عین جوانی کے عالم میں وفات پائی۔ وفات سے قبل سکندر اعظم سے ارسطو کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ سکندر اعظم نے اس کے بھتیجے کالستھینز کو ہلاک کروا دیا تھا جس پر ارسطو نے احتجاج کیا۔ ارسطو کے احتجاج پر سکندر اعظم نے کہا تھا کہ "میں قدرت کاملہ رکھتا ہوں اور فلسفیوں کو ہلاک کر سکتا ہوں۔" اس مخالفت کے باوجود ارسطو نے سکندر اعظم کی حمایت جاری رکھی۔

یونان کی چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستیں سکندر اعظم سے خوش نہ تھیں۔ لہٰذا اس کی وفات کے ساتھ ہی ایتھنز کی وہ حکومت جو سکندر اعظم کی فتوحات کی حامی تھی ناکام ہو گئی اور مخالف پارٹی برسر اقتدار آ گئی جس سے ایتھنز کی سیاسی فضا یکسر تبدیل ہو گئی۔

ہوگئی۔ اسوکرتیز کے دبستانی خطابات کے ارکان اور ڈیما ستھنز کے فصیح و بلیغ طنز کے متوالوں نے ارسطو کی موت یا جلاوطنی کا مطالبہ کیا۔ ایتھنز کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا جس پر سکندر اعظم کی حامی مقدونی جماعت کے بیشتر ارکان فرار ہوگئے۔ ارسطو چونکہ مقدونیہ کا معتمد اور سکندر کا استاد تھا اس لیے اس کے خلاف کارروائی کرنا اتنا آسان کام نہ تھا لہٰذا کافی سوچ بچار کے بعد لامیہ کی جنگ میں سیاسی دشمنی کے باعث شہر کے بڑے پروہت یوری میدون نے ارسطو پر دینی امور میں دخل اندازی کا الزام لگایا اور کہا کہ "وہ دعا اور قربانی کا مخالف ہے۔" لہٰذا ارسطو یہ کہتے ہوئے کہ "میں ایتھنز کے شہریوں کو یہ موقعہ نہیں دے سکتا کہ وہ دوسری بار فلسفے پر ظلم ڈھائیں۔" 322 ق م میں ایتھنز شہر چھوڑ کر مقدونیہ کے مضبوط اور متمول شہر لیکس یا چالیس (Chalics) کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں وہ بیمار ہوا اور کچھ مہینے تنہائی میں گزار کر سکندر اعظم کی موت کے ٹھیک دو سال بعد 63 سال کی عمر میں موسم گرما کی ایک شام اپنی جان خالق حقیقی کے سپرد کر دی اور اس طرح انسانیت کو علم کی اوج ثریا پر لے جانے والا فلسفی یوبیا کے مقام پر چپ چاپ منوں مٹی کے تلے جا سویا۔ ارسطو نے مرنے سے پہلے ایک مختصر اور عہد آفرین وصیت نامے کے ذریعے اپنے تمام غلاموں کو آزادی بخشی اور یہ تاریخ کا سب سے پہلا اعلان آزادی تھا۔

ارسطو کے براہ راست شاگردوں میں تھیوفراسٹس اور یوڈیمس تھے جنہوں نے ارسطو کی تعلیمات کو آگے بڑھایا۔ تھیوفراسٹس ارسطو کا وفادار دوست اور عالم ہونے کے علاوہ فصیح و بلیغ خطیب تھا۔ اس نے ارسطو کی قائم کردہ اکیڈمی میں تامرگ (286 ق م) کام کیا اور بڑا کامیاب معلم ثابت ہوا جبکہ یوڈیمس رہوڈس شہر میں فلسفے کا معلم تھا۔ سمپلیسوس کے مطابق وہ ارسطو کا سب سے زیادہ وفادار شاگرد تھا۔ وہ تھیوفراسٹس سے زیادہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چلا اور اسی باعث اس نے منطق میں تو تھیوفراسٹس کی اصلاحات کو قبول کیا لیکن طبیعیات میں وہ پوری طرح ارسطو کا ہمنوا رہا۔

تھیوفراسٹس نے اپنی ساری جائیداد اکیڈیمی کے نام منتقل کر دی تھی وہ اگرچہ ارسطو کے نظام فلسفہ کے اندر رہ کر کام کرتا رہا لیکن وہ جزوی امور میں آزادانہ تحقیقات کے ذریعے ترمیم و اضافہ بھی کرتا رہا۔ اس نے ارسطو کی منطق میں بہت سے اضافے اور تبدیلیاں کیں۔ اس نے منطق سے قضایا کی بحث کو الگ کر کے قیاس استخراجی میں افتراضی اور انفعالی استاج کو داخل کیا۔ اس نے ارسطو کے نظریہ حرکت میں بھی تبدیلی کی جس سے اہم شکوک پیدا ہوئے۔ تھیوفراسٹس تفکر انسانی کو روح کی حرکت قرار دیتا ہے۔ شادی اور تاہل کے خلاف تھا جانداروں کی قربانی اور گوشت خوری کو ناجائز سمجھتا تھا۔

یوڈیمس کے نزدیک "اخلاقیات اور دینیات ایک ہیں۔ نیکی کا میلان خدا کی جانب سے ہے اور تفکر خدا کی ذات کا تفکر ہے اور تمام اشیاء و اعمال کی قیمت اسی تفکر پر منحصر ہے۔"

ارکسٹو کسینوس اور ڈیسیرکس بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ارکسٹو کسینوس کو اپنی تصنیف موسیقیات (Harmonies) کے باعث شہرت ملی۔ اس کے نزدیک "روح جسم کی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے" وہ بقائے روح کا مخالف تھا۔ ڈیسیرکس اگرچہ عملی زندگی کو عملی زندگی پر ترجیح دیتا تھا لیکن سیاسیات میں وہ ارسطو کا قائل تھا اور مرتے دم تک ارسطو کے اساسی تصورات پر قائم رہا۔

سٹراٹو تھیوفراسٹس کی موت کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ نظریات ارسطو کو قابل تصحیح سمجھتا تھا اور وہ ارسطو کے روحی اور سوبنی نظریہ عالم کا بالکل مخالف تھا۔ اس کے نزدیک گرمی مظاہر کا عام ترین ماخذ ہے اور انسانی روح مطلق حیوانی روح سے الگ ہے۔ روح کے تمام افعال تفکر اور تاثر انسانی عقلی وجود کے حرکات کا نتیجہ ہے جس کا مقام دو ابروؤں کے درمیان ہے۔"

سٹراٹو کے بعد لائکو، ارسٹو، کریٹولاس، ڈیوڈورس اور ارمیوس ارسطو مکتبہ فکر کے امام رہے۔ لیکن یہ لوگ زیادہ تر عملی فلسفے کی جانب راغب تھے۔

المصلوب (حیاتِ منصور بن حلاج)

دینِ الٰہی آغاز سے انجام تک

اللہ کی تلوار (حیاتِ خالد بن ولیدؓ)

پاکستان میں فوجی حکومتیں

قائداعظم سے رفیق احمد تارڑ تک

ٹیپو سلطان سے بہادر شاہ ظفر تک

پاکستانی سیاست کی نصف صدی

میں بھلا غم سے آشنا کب تھا (شاعری)

نپولین

افلاطون

راسپوٹین

دی پرنس

نظریاتِ سرسید

الیگزینڈر دی گریٹ

فاطمہ جناح سے بینظیر بھٹو تک

جاناں خیال رکھنا (شاعری)

ہٹلر

سقراط

ارسطو

# شاہد مختار


ایم اے (انگلش) ایم اے (ہسٹری)

ایم سی ایس ایل ایل بی